اسلام

اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔ ۲۵

Vol. LVIII No.3 R.N.I. No. 17614/69 July 2026

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

Peer Reviewed
ISSN 2278-2109

Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-25
Phone: 011-26981717 Ext. 3240 E-mail: zhis@jmi.ac.in

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر اعلیٰ

پروفیسر حبیب اللہ خاں

مدیر

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

نائب مدیر

ڈاکٹر محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

Peer Reviewed

ISSN 2278-2109

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد:۵۸	جولائی۲۰۲۶ء	شمارہ:۳

زرِ اشتراک

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرونِ ملک	-/100 روپے	-/380 روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتیاتی رکنیت:

❑ اندرونِ ملک5000/روپے ❑ پاکستان و بنگلہ دیش 150امریکی ڈالر ❑ دیگر ممالک400امریکی ڈالر

نوشاد عالم
تصحیح وتزئین

فیضی گرافکس
کور ڈزائن

راشد احمد
پرنٹنگ اسسٹنٹ

ملنے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

Website: https://jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

نوٹ: مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

بانی و مدیر

ڈاکٹر سیّد عابد حسین (مرحوم)

شیخ الجامعہ

پروفیسر مظہر آصف (صدر)

مجلسِ مشاورت

- پروفیسر نجمہ اختر
- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ (آئی۔اے۔ایس۔ریٹائرڈ)
- محمد احمد ذکی (لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ)

مجلسِ ادارت

- پدم شری پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر اقتدار محمد خاں
- پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی
- پروفیسر شمس کمال انجم
- پروفیسر محمد مسیح الرحمٰن
- ڈاکٹر محمد ارشد
- ڈاکٹر صہیب عالم
- ڈاکٹر آفتاب احمد
- پروفیسر زبیر احمد فاروقی
- پروفیسر عبدالحلیم
- پروفیسر فوزان احمد
- پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی
- ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی
- ڈاکٹر ہیفاء شاکری
- ڈاکٹر وارث مظہری

فہرست مراجعین

- پروفیسر محمد اسحاق
  سابق پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- پروفیسر محمد ایوب ندوی
  شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- پروفیسر عبدالماجد قاضی
  شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

- پروفیسر فہیم اختر ندوی
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد)

- ڈاکٹر وارث مظہری
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد (نئی دہلی)

- ڈاکٹر خالد خاں
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- ڈاکٹر مغیث احمد
  شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی (وارانسی)

فہرست

❑ حرفِ آغاز	ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی	۷
❑ انسانی تخلیق کا پُراسرار آغاز کیا حضرت آدم کا پہلا نزول برصغیر ہند میں ہوا تھا؟	پروفیسر مظہر آصف	۱۵
❑ فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید ایک بصیرت افروز مقدمہ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۲۷
❑ اسلام دین رحمت ہے	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	۳۹

❏ سورۃ النحل کی آیتِ امر و نہی میں آفاقیتِ قرآن کی چند جھلکیاں	پروفیسر سید مسعود احمد ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی	۷۳
❏ فی ملکوت کا اردو ترجمہ: ایک جائزہ	ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی	۸۹
❏ فکر آزاد اور حب الوطنی	ڈاکٹر ہیفا شاکری	۹۹
❏ اجتہاد کا تصور اور اس کے اطلاق و تطبیق میں حائل رکاوٹیں	ڈاکٹر ریحان اختر	۱۱۷
❏ اسلامی مطالعات روایتی، مغربی اور جدید رجحانات	ڈاکٹر سید عبدالرشید	۱۳۷

حرف آغاز

ربیع الاول:
سیرتِ نبوی ﷺ اور عصر حاضر کے مسائل

ماہِ ربیع الاول کی آمد آمد ہے۔ اس ماہِ مبارک کے آتے ہی جناب رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مختلف گوشوں پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسے منعقد ہوتے ہیں اور حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اسی ماہِ مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور اسی ماہِ مبارک میں اس عالم رنگ و بو سے پردہ فرمایا۔ جہاں تک گردشِ ماہ وایام کا تعلق ہے وہ دراصل واقعات وحوادث کی مرہون منت نہیں ہوتی، ماہ وایام تو ہمیشہ نئے اور ہمیشہ منفرد ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝

[ترجمہ: وہ ہر دن ایک نئی شان میں ہے۔] (سورہ الرحمٰن، آیت: ۲۹)

تاہم انسان کی فطرت ہے کہ وہ چیزوں کو نسبتوں کے ذریعے پہچانتا اور یاد رکھتا ہے، اسی لیے ربیع الاول میں لوگ سیرت کے مطالعے اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد کو تازہ کرنے میں زیادہ مصروف ہو جاتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہر لمحہ اور ہر آن، ہر مسلمان کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے اسوہ اور نمونہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ زندگی کے ہر پہلو میں کامل اور مکمل رہنمائی فراہم کرتی ہے اور کاروبارِ حیات کے لیے جامع ہدایت پیش کرتی ہے۔ اسی لیے کسی ایک دن یا ایک مہینے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ہستی کو مخصوص کرنا گویا اس کی عظمتوں کو محدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سال کے بارہ مہینوں، ہفتے کے سات دن، دن کے چوبیس گھنٹوں اور زندگی کے ہر گوشے کے لیے مسلسل رہنما ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تعلیمات میں زندگی کے ہر لمحے کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ اگر انسان ان تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنالے تو اس کی زندگی حقیقی معنوں میں سنور سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک ایسے بدوی معاشرے میں مبعوث فرمایا جو جہالت کی تاریکی، ظلم و ستم اور لاقانونیت کے بدترین دور سے گزر رہا تھا، بلکہ صرف عرب ہی اس صورتِ حالت سے دوچار نہیں تھا؛ اس زمانے میں پوری دنیا کا عمومی منظرنامہ کچھ ایسا ہی تھا۔ ہر طرف وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا۔ عرب اگرچہ قبائلی معاشرے میں زندگی بسر کرتے تھے، لیکن ربع سکوں کے جن علاقوں اور خطوں میں باقاعدہ حکومتیں قائم تھیں، وہاں بھی حالات میں کوئی نمایاں خوبی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ باہمی جنگیں، خونریزیاں، انسانوں کے درمیان امتیاز اور معمولی باتوں پر طویل معرکے عام تھے۔ نسلی، علاقائی اور قبائلی تعصّبات نے پوری انسانیت کو جکڑ رکھا تھا اور عورتوں، کمزوروں اور بے وسیلہ لوگوں کو مشقِ ستم بنایا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا عظیم انقلاب برپا کیا جس نے مکمل طور پر انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اگرچہ ابتدا میں اس انقلاب کے

اثرات بڑی حد تک عرب کے اندر ظاہر ہوئے، یعنی عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر ایسا معاشرہ قائم کر دیا جسے تمام انسانی معیارات کے لحاظ سے ایک مثالی معاشرہ (Idial Society) کہا جا سکتا ہے اور بہت کم عرصہ میں یہ پیغام اس وقت کی تمام دنیا میں پہنچ گیا۔

عرب کے اندر اس انقلاب کے بعد جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے معاشرے میں علم کی بہار آ گئی۔ ظلم و ستم سے کراہتے ہوئے ریگستان میں امن و عافیت اور عدل و انصاف کا نخلستان وجود میں آ گیا۔ معمولی معمولی باتوں پر خو بہانے والے لوگ زندگی کے محافظ بن گئے۔ اپنی تن آسانی کے لیے دوسروں کو قربان کرنے والے لوگ دوسروں کے آرام و راحت کے لیے خود کو قربان کرنے لگے۔ عورت کے وجود کو کلنک سمجھنے والے اور بیٹوں کو زندہ دفن کرنے والے لوگ بیٹی کی پیدائش کو باعثِ رحمت سمجھنے لگے۔ بیویوں کو محکوم اور بے اختیار سمجھنے والے لوگ انھیں عزت اور مساوات کا مقام دینے لگے۔ جس معاشرے میں عورت کا کوئی موثر سماجی کردار نہیں تھا وہاں اسے وہ بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوئے جو مردوں کو حاصل تھے اور اسے معاشرے میں باوقار کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اثر یہ تھا کہ جو لوگ جوئے کے شوقین تھے انھوں نے جوا چھوڑ دیا۔ ہمہ وقت شراب میں ڈوبے رہنے والے لوگوں نے ایک فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر شراب کے برتن گلی کوچوں میں پھینک دیے۔ حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز لوگوں کے اندر ایسا پختہ ایمان پیدا ہو گیا کہ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں سب سے پہلے یہ دیکھنے لگے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اندر ایک ایسا مثالی اور معیاری معاشرہ قائم کیا۔

دنیا دراصل امتحان کی جگہ ہے؛ اس میں مسائل ہمیشہ رہیں گے اور ان کے حل کی کوششیں بھی ہمیشہ جاری رہیں گی۔ آج کی دنیا میں بعض وہ مسائل شاید موجود نہیں ہیں یا کم شدت کے ساتھ موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے زمانے میں رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود انسانیت آج بھی ایک بے چارگی کی شکار ہے جس میں بنیادی انسانی مسائل کی نوعیت بہت حد تک وہی ہے۔ دنیا میں آج بھی مختلف قسم کے تعصّبات موجود ہیں جنھوں نے عالمی امن کو شدید متاثر کر رکھا ہے۔ آج کا انسان صارفیت (Consumerism) کے جال میں اس طرح الجھ گیا ہے کہ اپنی خواہشات اور آسائشوں کی تسکین کے لیے اس نے پورے نظامِ فطرت کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ صنعتی آسودگی نے زمین کے سینے میں محفوظ پانی کو زہر آلود کر دیا ہے۔ وسائلِ حیات اور معاشی ترقی کی دوڑ میں زمین کے حسن میں چار چاند لگانے والے باغات اور جنگلات کو بے دریغ کاٹا جا رہا ہے۔ انسانی سرگرمیوں کے نتیجے میں فضا میں بھری ہوئی جان بخش ہوا بھی آلودہ ہوگئی ہے۔ کل تک جو پانی زمین سے نکال کر براہِ راست پیا جا سکتا تھا، آج اسے مشینوں سے صاف کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ جن گھروں اور گزرگاہوں میں لوگ بے فکری سے سانس لیا کرتے تھے، آج انھی گھروں میں اندر ہوا کو صاف رکھنے کے لیے مشینیں لگانی پڑ رہی ہیں اور شہروں میں فضائی آلودگی کو کم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس بات کی علامت ہے کہ انسان نے ترقی کے نام پر فطرت کے ساتھ اپنے تعلق میں ایک خطرناک عدمِ توازن پیدا کر دیا ہے۔

صارفیت کے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ٥ [ترجمہ: فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔] (سورہ بنی اسرائیل، آیت: ۲۷)

اسی حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعدؓ کے پاس سے گزرے، وہ وضو کررہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'یہ کیسا اسراف ہے؟' انھوں نے عرض کیا: 'کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'ہاں، خواہ تم بہتی نہر کے کنارے ہی کیوں نہ بیٹھے ہو'۔ رسول اللہ کی یہ تعلیم آج کے ماحولیاتی بحران کے تناظر میں غیر معمولی معنویت رکھتی ہے۔ وسائلِ فطرت کو بے دریغ استعمال کرنے کے بجائے ان کی حفاظت، اعتدال اور ذمہ دارانہ استعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

اسی طرح ایثار وقربانی کا وہ جذبہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کے اندر پیدا کیا تھا، آج بھی اسی شدت سے درکار ہے۔ قرآن مجید میں اہلِ ایمان کی اس صفت کا ذکر کیا گیا ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥ [ترجمہ: اوران کو اپنی جانوں پر مقدم رکھتے ہیں خواہ خود انھیں احتیاج ہی ہو، اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔] (سورۃ الحشر، آیت: ۹)

آج کے دور میں مختلف قسم کے تعصّبات انسانی معاشرے کے لیے ایک مسئلہ ہیں۔ ان تعصّبات کی جڑ کاٹنے کے لیے قرآن مجید کا یہ واضح فرمان ہمارے سامنے ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ٥ [ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے اس لیے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ (ورنہ) اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔] (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درسِ مساوات کی معنویت اس ارشاد سے بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ بے شک کسی عربی کو کسی عجمی اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فوقیت نہیں۔''

اپنی دولت دوسروں میں بانٹنا، خود قربانی دینا، دوسروں کا بھلا کرنا، معاشرے کی تعمیر وترقی کے لیے جدوجہد کرنا اور انسانیت کا نام بلند کرنا، یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا حصہ ہیں۔ ان تعلیمات کی بنیاد پر دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر معمولی کارنامہ بھی تھا اور وہ تھا عام انسانوں کی صلاحیتوں کو نکھارنا، ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا اور ہر انسان کو اس کا بہترین وجود بننے کا موقع فراہم کرنا، اسلام سے قبل عرب موجود تھے، لیکن وہ جہالت کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ تہذیب وتمدن کی دنیا میں ان کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس برس ان کی تربیت کی، ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا، انھیں فطرت کے مظاہر کی پرستش سے نکال کر خالقِ حقیقی کے دربار تک پہنچایا اور ان کے اندر اللہ کی وحدانیت کا ایسا یقین پیدا کیا کہ وہ تمام معبودانِ باطل کو چھوڑ کر اللہ رب العالمین کی اطاعت اور عبادت میں لگ گئے۔ ان تئیس برسوں میں ان کی ایسی تربیت ہوئی کہ جو جاہل تھے، وہ عالم بن گئے؛ جو غیر مہذب تھے، وہ تہذیب کے امام بن گئے۔ اسلام کی آمد نے صرف ان کی مذہبی زندگی نہیں بدلی، بلکہ دنیا کے علوم، زبان، جغرافیہ، سیاست، تہذیب وثقافت اور انسانی معاشرے کے لیے بے شمار پہلوؤں کو متاثر کیا۔ گویا ایک ایسا معاشرہ جو تاریخ کے حاشیے پر تھا تاریخ کے مرکز میں آ گیا۔ عربوں کے اندر اس غیر معمولی تبدیلی پر غور کیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے علاوہ ان کی

زندگی میں کوئی ایسی اضافی مادی چیز نظر نہیں آتی جس نے انھیں یکسر بدل دیا ہو۔ عربوں کی زندگی میں اسلام داخل ہوا تو ان کی زندگیاں بدل گئیں، ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوگئیں اور ان کی شخصیت کے بہترین پہلو سامنے آ گئے۔ اسلام ان کے لیے گویا پارس بن گیا؛ اس کے لمس سے ان کی شخصیت کا بہترین پہلو نمایاں ہوگیا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ صفر سے ہیرو بن گئے۔

دراصل انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے خود ہی اعلیٰ و اشرف مخلوق ہے، لیکن جس طرح کسی بھی اچھے کام کے لیے محنت درکار ہوتی ہے، اسی طرح انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے بھی محنت، جذبے اور ایک مضبوط نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام کے آنے سے عربوں کے اندر یہی تبدیلی پیدا ہوئی اور ان کی زندگیوں کا رخ بدل گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات آج بھی اسی طرح موجود ہیں جس طرح عہدِ رسالت میں موجود تھیں۔ اللہ کی کتاب کا ہر لفظ محفوظ ہے، اور ہر قسم کے ریب و شک سے پاک ہے۔ وہ زبان بھی زندہ ہے جس میں یہ کلام نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کا ایک عظیم ذخیرہ بھی محفوظ ہے۔ ہمارے پاس وہی قرآن موجود ہے، وہی نبوی تعلیمات موجود ہیں اور وہی رہنمائی آج بھی انسان کے سامنے ہے جو چودہ برس پہلے ایک بکھری ہوئی انسانیت کو راستہ دکھا رہی تھی۔ قرآن مجید اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات آج بھی انسانیت کے لیے جرعۂ آبِ حیات سے کم نہیں۔ اسلام کے اندر آج بھی انسانیت کے بنیادی مسائل کا حل موجود ہے۔ اگر لوگ آج اسلام پر پوری طرح عمل نہیں کرتے تو اس کی وجہ اسلام کی تعلیمات نہیں بلکہ انسانوں کی کوتاہیِ عمل اور ارادوں کی کمزوری ہے۔ اسلام کا مطلب اکڑنا نہیں، جھکنا ہے؛ اللہ کے فرمان کے سامنے جھکنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے سامنے جھکنا۔ انسان جب اپنے رب کے سامنے جھکتا ہے تو کائنات اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے اور انسان کی زندگی میں

ایک حقیقی انقلاب پیدا ہوتا ہے۔
آج بھی کتنی سعید روحیں ایسی ہیں جنھیں اسلام کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے بھی مسائل سے نجات ملتی ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آج کے انسانی مسائل......جنھیں موجودہ دور میں ''فلائٹ آف ماڈرن مین'' یا جدید انسان کی بےقراری، بےسمتی اور داخلی اضطراب کے عنوان سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے...... کے لیے اگر کوئی حقیقی راہِ نجات ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی پیروی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے وابستگی میں ہے۔ ماہِ ربیع الاول اسی حقیقت کی یاددہانی کا ایک اہم موقع ہے۔ یہ ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ کا تذکرہ نہ کریں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کریں، سیرت کے پیغام کو سمجھیں اور اسے اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ سیرتِ طیبہ صرف ماضی کی ایک روشن داستان نہیں؛ یہ آج کے انسان کے لیے بھی زندہ رہنمائی ہے۔ اس کی روشنی میں ہم اپنے کردار کو سنوار سکتے ہیں، اپنے معاشرے کو بہتر بنا سکتے ہیں اور انسانیت کو درپیش بہت سے مسائل کا سامنا زیادہ ذمہ داری، اعتدال، عدل، ایثار اور اخلاق کے ساتھ کرسکتے ہیں۔
ربیع الاول کی اصل معنویت شاید یہی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف یاد نہ کریں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں زندہ کریں اور اس طرح اپنے عمل اور فکر کا حصہ بنالیں کہ جب اگلی مرتبہ یہ مبارک مہینہ آئے تو ہمارے سامنے اظہارِ شکر کا موقع ہو کہ ہم کو اس دولت کا گراں قدر حصہ ملا، اظہارِ افسوس کی خفت نہ ہو کہ پورا سال ضائع ہوگیا۔

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

پروفیسر مظہر آصف *

انسانی تخلیق کا پُر اسرار آغاز

کیا حضرت آدم کا پہلا نزول برصغیر ہند میں ہوا تھا؟

انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی سوال ایسا ہو جس نے انسانی ذہن کو اتنا متجسس کیا ہو جتنا انسان کی اصل ابتدا اور اس کی تخلیق کے مسئلے نے۔ صدیوں سے اہلِ علم، مفکرین، فلسفیوں، سائنس دانوں اور مذہبی رہنماؤں کے درمیان اس موضوع پر مسلسل بحث ہوتی رہی ہے، تاہم انیسویں صدی میں برطانوی ماہر حیاتیات چارلس ڈارون نے جب اپنا معروف نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) پیش کیا تو یہ بحث مزید گہری اور ہمہ گیر ہوگئی، کیوں کہ اس نظریے نے انسانی تخلیق کی ایسی تعبیر پیش کی جو قرآن مجید، تورات، انجیل اور دیگر مقدس صحائف میں بیان کردہ تصورِ تخلیق سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔

انسانی تخلیق کے اس نہایت اہم اور دلچسپ موضوع کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا مختصر جائزہ لیں، اس کے بعد ان تصورات کا تقابلی مطالعہ کریں جو مختلف مذہبی روایات میں انسان کی پیدائش اور آغازِ حیات کے بارے میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس تقابلی مطالعے سے نہ صرف مختلف مذہبی اور فکری روایتوں کے درمیان مماثلتوں اور اختلافات کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ اس مضمون کے بنیادی سوال تک پہنچنے کی راہ بھی ہموار ہوگی، اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا حضرت

* وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔ ۲۵

آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر بھیجے جانے کے بعد سب سے پہلے برصغیر ہند کی سرزمین پر اتارا گیا تھا؟

چارلس ڈارون کے مطابق انسانی تاریخ کا آغاز کسی الوہی تخلیق سے نہیں بلکہ لاکھوں برسوں پر محیط ایک حیاتیاتی ارتقائی عمل سے ہوا، جو مشترکہ اجداد اور قدرتی انتخاب کے ذریعے آگے بڑھا۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس تمام آسمانی صحیفے انسان کی تخلیق کو براہِ راست خدائی فعل قرار دیتے ہیں۔ آیئے ترتیب وار ان صحیفوں کے بیانات پر نظر ڈالتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم تورات کا جائزہ لیتے ہیں، جو بائبل اور قرآن مجید دونوں سے قبل نازل ہونے والی آسمانی کتاب ہے۔

تورات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھے مراحل، جنھیں عموماً چھے دنوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، میں پیدا فرمایا اور ساتویں دن آرام کیا۔ تخلیقِ کائنات کا آخری اور سب سے اہم مرحلہ انسان کی تخلیق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم کو اپنی شبیہ (Tzelem Elohim) پر پیدا کیا اور انھیں دیگر تمام مخلوقات کے مقابلے میں ایک منفرد روحانی اور اخلاقی مقام عطا فرمایا۔ اس کے بعد حضرت آدم کی رفاقت کے لیے حضرت حوا (Chavah) کو پیدا کیا گیا۔ دونوں کو باغِ عدن (Garden of Eden) میں بسایا گیا، جہاں انھیں باغ کی تمام نعمتوں سے استفادہ کرنے کی آزادی دی گئی، البتہ شجرِ علمِ خیر و شر کا پھل کھانے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔ تاہم جب حضرت آدم اور حضرت حوا نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا تو انھیں باغِ عدن سے نکال کر زمین پر بھیج دیا گیا۔ اسی واقعے کے بعد انسانی زندگی میں محنت، مشقت، دکھ، تکلیف اور موت کا آغاز ہوا۔ پوری نسلِ انسانی حضرت آدم اور حضرت حوا کی اولاد ہے، جبکہ حضرت نوح علیہ السلام کے عظیم طوفان کے بعد دنیا کی آبادی ان کے خاندان کی نسل سے دوبارہ آگے بڑھی۔ (پیدائش، ابواب: ۱-۲)

اب آیئے مقدس بائبل کا جائزہ لیتے ہیں۔ انسانی تخلیق کے حوالے سے بائبل کا بیان بڑی حد تک تورات سے مطابقت رکھتا ہے، کیونکہ بائبل کی ابتدائی پانچ کتابیں دراصل تورات ہی کے متوازی سمجھی جاتی ہیں، اگرچہ ترجمے اور بعض متنی روایات کے اعتبار سے ان میں چند اختلافات ضرور پائے جاتے ہیں۔

بائبل کے مطابق:

''ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔'' (پیدائش:۱:۱)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

''پس خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا؛ خدا ہی کی صورت پر اسے پیدا کیا، مرد اور عورت دونوں کو اس نے پیدا کیا۔'' (پیدائش ۱:۲۷)

مزید بیان کیا گیا ہے:

''پھر خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا، تو انسان جیتی جاگتی جان بن گیا۔'' (پیدائش، ۲:۷)

''خدا نے آدم کی ایک پسلی سے حوا کو اس کی رفیقہ کے طور پر پیدا کیا۔'' (پیدائش، ۲:۲۱-۲۲)

اس کے بعد بائبل بیان کرتی ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے نیکی اور بدی کی معرفت کے درخت کا پھل کھا کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی۔ اس نافرمانی کے نتیجے میں گناہ، تکلیف اور موت انسانی زندگی کا حصہ بن گئے اور دونوں کو باغ عدن سے نکال دیا گیا۔ (پیدائش:۳)

چنانچہ بائبل بھی تورات ہی کی طرح پوری نسل انسانی کا سلسلہ نسب حضرت آدم سے شروع کرتی ہے، جو بعد ازاں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد کے ذریعے طوفانِ عظیم کے بعد آگے بڑھتا ہے۔

اب ہم آخری آسمانی کتاب، قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں، جس نے انسانی تخلیق کے بارے میں نہایت واضح، جامع اور. متوازن تصور پیش کیا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے۔ اللہ نے انھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر فرمایا ہو جا تو وہ ہو گئے۔ (سورہ آلِ عمران، آیت:۵۹)

حضرت آدم کی تخلیق مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی روح پھونکی جس کے نتیجے میں انسان کو وہ عزت، شعور اور امتیازی مقام عطا ہوا جو دیگر تمام مخلوقات سے اسے ممتاز کرتا ہے۔ (سورۃ

الحجر، آیت:۲۹، سورہ ص، آیت:۷۲)

بائبل کے برخلاف، قرآن مجید حوا کی تخلیق کی تفصیل بیان نہیں کرتا۔ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا (سورۃ النساء، آیت:۱؛ سورۃ الاعراف، آیت:۱۸۹) بعد کی اسلامی روایات میں اس اولین جوڑے کی شناخت حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کے نام سے کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حوا کو جنت میں قیام کا حکم دیا اور انھیں جنت کی تمام نعمتوں سے استفادہ کرنے کی اجازت دی، البتہ ایک مخصوص درخت کے قریب جانے سے منع فرمایا۔ (سورہ البقرہ، آیت:۳۵، سورہ الاعراف، آیت:۱۹)

یہیں سے وہ مشہور واقعہ شروع ہوتا ہے جس کا ذکر تمام ابراہیمی مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں ملتا ہے۔ ابلیس نے حضرت آدم اور حضرت حوا کو یہ کہہ کر بہکایا کہ اگر وہ ممنوعہ درخت کا پھل کھالیں تو ہمیشہ کی زندگی اور لازوال بادشاہت حاصل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی واضح ممانعت کے باوجود وہ شیطان کے فریب میں آ گئے اور ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا۔ تاہم جیسے ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، انھوں نے فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور سچے دل سے توبہ کی، اپنی خطا کا اعتراف کیا اور اللہ سے معافی مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان نے کی توبہ قبول فرمائی، لیکن اپنی ازلی حکمت کے مطابق انھیں جنت سے زمین پر اتارنے کا فیصلہ فرمایا، جہاں وہ اور ان کی آئندہ نسلیں قیامت تک زندگی گزاریں گی۔ پھر روزِ محشر ہر انسان کو اس کے اپنے اعمال کی بنیاد پر جواب دہ ہونا ہوگا، اور اس کے مطابق اسے جنت یا جہنم کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ (سورۃ البقرہ، آیات:۳۵-۳۷؛ سورۃ الاعراف، آیات:۲۰-۲۵)

عیسائیت کی بہت سی روایات میں گناہ اول (Original Sin) کا نظریہ پایا جاتا ہے، جس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کے اثرات پوری نسل انسانی تک منتقل ہوئے۔ اس کے برعکس قرآن مجید یہ واضح اصول پیش کرتا ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (سورۃ الانعام، آیت:۱۶۴؛ سورۃ النجم، آیت:۳۸) حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کو نسل انسانی کا موروثی گناہ قرار نہیں دیا گیا، نہ ہی آنے والی نسلوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور اہم حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ حضرت آدم اور حضرت حوا کی لغزش پر گفتگو کرنے سے پہلے ان کی تخلیق اور زمین پر آمد کے اصل مقصد کو سمجھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زمین پر بھیجا جانا محض ایک سزا نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی ازلی حکمت اور انسانیت کے لیے طے شدہ منصوبے کا حصہ تھا۔ حضرت آدم کی تخلیق سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا تھا: میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ (سورۃ البقرہ، آیت: ۳۰) اسلامی روایات کے مطابق اس اعلان سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے، لیکن انھوں نے فساد، خونریزی اور بدامنی کو فروغ دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین کی خلافت عطا فرمائی تاکہ وہ اس دنیا میں اس کے نائب کی حیثیت سے عدل، خیر اور ہدایت کے مطابق زندگی گزارے۔ اس مقصد تخلیق کو قرآن مجید ایک اور مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: ''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (سورۃ الذاریات، آیت: ۵۶)

ابراہیمی مذاہب کے برعکس ہندو مذہبی روایت میں انسانی تخلیق کے بارے میں کوئی ایک متفقہ یا یکساں نظریہ نہیں ملتا۔ ہندومت کے مقدس صحائف، فلسفیانہ متون اور مذہبی روایات ایک وسیع علمی سرمایہ ہیں، جن میں کائنات اور انسان کی پیدائش سے متعلق متعدد تصورات بیان کیے گئے ہیں۔ ان روایات کی بنیاد زیادہ تر مذہبی اور کائناتی فلسفے پر ہے، نہ کہ سائنسی یا تاریخی تشریح پر۔

ہندو مذہبی ادب میں سب سے معروف روایت پُرانوں (Puranas) میں ملتی ہے۔ ان کے مطابق تری مورتی (برہما وشنو اور شیو) میں سے برہما کو خالق کائنات قرار دیا گیا ہے۔ انہی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کائنات اور تمام جانداروں کو وجود بخشا۔ ان روایات کے مطابق برہما نے پہلے انسان اور دیگر مخلوقات کو یا تو اپنے ذہن سے یا اپنے جسم سے پیدا کیا۔ پہلے مرد کو عموماً سوائم بھومنو (Svayambhuva Manu) اور پہلی عورت کو شتروپا (Shatarupa) کہا جاتا ہے، اور یہی دونوں پوری نسل انسانی کے جدامجد سمجھے جاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض پہلوؤں سے منو کا کردار ابراہیمی مذاہب کے حضرت نوح علیہ السلام سے مشابہت رکھتا ہے، خصوصاً اس اعتبار سے کہ دونوں کو انسانی نسل کے تسلسل اور بقا سے جوڑا جاتا ہے۔ ہندو روایت میں انسانی تخلیق کا ایک اور اہم بیان رگ وید کے قدیم ترین تخلیقی بھجن پروش

سوکت (SuktaPurusha) (رگ وید ۱۰:۹۰) میں ملتا ہے۔ اس میں کائنات کو ایک عظیم کائناتی ہستی پرش (Purusha) کی قربانی سے وجود میں آنے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کائنات کے مختلف اجزا پرش کے جسم کے مختلف حصوں سے وجود میں آئے، اور انسانیت، چاروں ورنوں (سماجی طبقات) کے ساتھ، علامتی طور پر اس کائناتی وجود سے پھوٹتی دکھائی گئی ہے۔ زیادہ تر تحقیقات اس روایت کو انسانی تخلیق کی لفظی یا حیاتیاتی تشریح کے بجائے ایک علامتی، فلسفیانہ اور روحانی تعبیر قرار دیتے ہیں۔

ان مختلف مذہبی روایات کا مختصر جائزہ لینے کے بعد اب ہم اس بنیادی سوال کی طرف آتے ہیں کہ اگر اولین انسان، خواہ وہ حضرت آدم وحوا ہوں یا منو اور شترو پا، آسمان یا جنت سے زمین پر بھیجے گئے تو ان کا پہلا نزول آخر کہاں ہوا؟

اس سوال کے بارے میں مختلف مذہبی اور تاریخی روایات الگ الگ آراء پیش کرتی ہیں۔ تاہم اس مضمون میں ہماری توجہ بنیادی طور پر اسلامی روایات پر مرکوز رہے گی، اور یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ ان روایات کا برصغیر ہند کی تہذیبی اور تاریخی روایت سے کیا تعلق بنتا ہے۔

اسلامی تاریخ، تفسیر اور آثار سے متعلق متعدد قدیم روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام، جو انسانیت کے پہلے فرد اور اللہ کے پہلے نبی تھے، کا برصغیر ہند سے گہرا تعلق رہا ہے۔ بہت سے ابتدائی مسلم علماء، مفسرین اور مؤرخین کی رائے ہے کہ جنت سے زمین پر اتارے جانے کے بعد حضرت آدم نے سب سے پہلے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ ان روایات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت حسن بصریؒ اور متعدد قدیم اسلامی مؤرخین و مفسرین سے منقول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارے جانے کے بعد ہندوستان میں اتارا گیا، جبکہ حضرت حوا علیہا السلام کو موجودہ سعودی عرب کے شہر جدہ میں اتارا گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور طویل عرصے تک ایک دوسرے کی تلاش کرتے رہے، یہاں تک کہ آخر کار مکہ مکرمہ کے قریب میدان عرفات میں واقع جبل رحمت پر ان کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ ایک اور معروف روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کا نزول موجودہ سری لنکا کے ایک بلند پہاڑ پر ہوا، جسے قدیم زمانے میں برصغیر ہند کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ پہاڑ آج آدمز پیک (Adam Peak) کے نام سے یا سری پادا (Sri

(Pad کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک بڑے قدم کے نشان جیسی ساخت موجود ہے، جسے مسلمان حضرت آدم علیہ السلام کے قدموں کا نشان قرار دیتے ہیں۔

آدمز پیک دنیا کے ان چند مقامات میں شامل ہے جو بیک وقت کئی مذاہب کے لیے مذہبی تقدس رکھتے ہیں۔ ساحل سمندر سے تقریباً 243,2 میٹر (359,7 فٹ) بلند یہ پہاڑ صدیوں سے مختلف مذہبی روایتوں کا مرکز رہا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ حضرت آدم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ہے، جبکہ بدھ مت کے پیروکار اسے گوتم بدھ کا نقش قدم مانتے ہیں۔ ہندو عقیدے کے مطابق یہ بھگوان شیو کے قدموں کے نشان ہیں، اور بعض عیسائی روایات میں اسے حضرت آدم علیہ السلام یا سینٹ تھامس سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مختلف مذاہب میں پائی جانے والی ان روایات کے باعث آدمز پیک صدیوں سے ایک اہم زیارت گاہ رہی ہے، جہاں ہر سال دنیا بھر سے لاکھوں زائرین اور سیاح حاضری دیتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے برصغیر ہند سے تعلق کے حوالے سے متعدد روایات ابتدائی اسلامی تاریخ، تفسیر اور آثار کی مختلف کتابوں میں ملتی ہیں۔ تاہم یہاں ایک نہایت اہم علمی نکتے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات، مستند احادیث نبوی، بعد کے تاریخی بیانات (اخبار) اور مفسرین کی روایات (تفاسیر) ایک ہی درجے کی حیثیت نہیں رکھتیں، اس لیے ان کے مابین فرق کو ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے۔ یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں کہیں بھی اس مقام کا تعین نہیں کیا گیا جہاں حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا تھا۔ اسی طرح صحیح اور قطعی سند والی احادیث میں بھی اس مقام کی صراحت موجود نہیں ہے۔ حضرت آدم کے ہندوستان یا موجودہ سری لنکا میں نزول سے متعلق بیشتر روایات بعد کے مسلم مؤرخین، مفسرین اور اصحاب آثار کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید میں اس کی بھی کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ حضرت آدم اور حضرت حوا کو جنت سے زمین پر کس کیفیت یا کس طریقے سے اتارا گیا۔

بعد کے اسلامی علماء میں امام محمد باقر بھی ان بزرگوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اس روایت کو قبول کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر تشریف لانے کے بعد ہندوستان میں اترے تھے۔ ان سے منسوب روایات کے مطابق حضرت آدم بعد میں پیدل مکہ مکرمہ تشریف لے گئے

اور وہاں حج ادا کیا۔ مزید یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ آپ کے مبارک قدم جہاں جہاں زمین پر پڑے، وہ علاقے سرسبز، شاداب اور زرخیز ہو گئے، جبکہ جن مقامات تک آپ کے قدم نہ پہنچ سکے وہ بنجر رہ گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ صحرا میں تبدیل ہو گئے۔

شیعہ مکتب فکر کی معروف کتاب حیات القلوب کے پہلے باب میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کے جنت سے زمین پر بھیجے جانے کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس روایت کے مطابق جب حضرت آدم سے لغزش سرزد ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ انھیں زمین پر لے آئیں۔ روایت میں مذکور ہے کہ زمین پر اترتے ہی حضرت آدم کا رنگ گہرا ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی رضا کے لیے روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ جب حضرت آدم نے مسلسل تین روزے رکھے تو ان کا رنگ دوبارہ اپنی سابقہ حالت میں لوٹ آیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے ہندوستان سے تعلق کے ضمن میں ایک دلچسپ روایت حجر اسود سے بھی متعلق ہے، جو آج خانہ کعبہ میں نصب ہے۔ امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ حجر اسود ابتدا میں اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں میں سے ایک فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک پتھر کی شکل عطا فرمائی اور یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ قیامت کے دن حج ادا کرنے والوں کے حق میں گواہی دے گا۔ اس روایت کے مطابق جب حضرت آدم علیہ السلام کو ہندوستان میں اتارا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ مقدس پتھر بھی ان کے پاس بھیج دیا۔ اس وقت اس کا رنگ چمکتے ہوئے سفید موتی کی مانند تھا۔ بعد ازاں جب حضرت آدم کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم ملا تو انھوں نے اس پتھر کو موجودہ مقام پر نصب کیا۔ صدیوں تک لاکھوں زائرین کے بوسہ دینے اور چھونے کی وجہ سے اس کا رنگ بتدریج سیاہ ہو گیا۔ اس روایت کی رو سے حجر اسود پہلے جنت سے ہندوستان لایا گیا اور بعد میں خانہ کعبہ میں نصب کیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کے ایک پہاڑ پر اترے جسے بدھ (باندھ) کہا جاتا تھا۔ مزید یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت آدم اپنے ساتھ جنت کے خوشبودار پھول اور پتے بھی لائے تھے، جنھیں انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر بکھیر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان دنیا کے چند نایاب ترین اور خوشبودار پھولوں کا حامل ہے۔ اس روایت کا ذکر معروف مؤرخ امام طبری نے اپنی تاریخ میں کیا ہے، جبکہ اس سے ملتی جلتی

روایات حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہیں۔

اسی طرح مشہور تابعی وہب بن منبہؒ سے روایت ہے کہ حضرت آدم جب جنت سے اتارے گئے تو مشرقی ہندوستان کے ایک پہاڑ پر اترے جسے باسم کہا جاتا تھا۔

تفسیر ابن کثیر میں سورۃ البقرہ کی تفسیر کے ضمن میں ربیع بن انسؒ کی ایک روایت نقل کی گئی ہے، جس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اترتے وقت جنت کے ایک درخت کی شاخ بھی اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے۔

ایک اور روایت جوام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منسوب ہے، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بعد اپنی اہلیہ حضرت حوا علیہا السلام کے ہمراہ دوبارہ ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔

اسی طرح ابن سعد نے اپنی کتاب الطبقات الکبری (جلد اول) میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارے جانے کے بعد ہندوستان ہی میں نزول نصیب ہوا۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ہندوستان کے تعلق کے ضمن میں ایک روایت امام حاکم کی کتاب المستدرک علی الصحیحین (حدیث: ۳۹۵۴) میں بھی نقل کی گئی ہے، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ہند کی جانب سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں۔

بعض روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جدہ کے قریب حضرت آدم اور حضرت حوا کے دوبارہ ملنے کے بعد حضرت آدم اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر ہندوستان واپس آئے، جہاں ان کے دونوں بیٹوں کی ولادت ہوئی۔ اس سلسلے میں جنوبی ہندوستان کے شہر رامیشورم میں موجود دو طویل قبروں کو بعض مقامی روایات میں حضرت ہابیل اور حضرت قابیل کی قبروں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ البتہ اس نسبت کی تاریخی یا حدیثی اعتبار سے کوئی قطعی اور مسلمہ سند موجود نہیں، بلکہ یہ روایت ایک قدیم عوامی روایت کے طور پر بیان کی جاتی ہے۔

اسلامی روایات میں حضرت شیث علیہ السلام، جو حضرت آدم علیہ السلام کے تیسرے

صاحبزادے اور ان کے بعد دوسرے نبی سمجھے جاتے ہیں، کا بھی بعض روایات میں برصغیر ہند سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق حضرت شیث کا مزار موجودہ ایودھیا میں واقع ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق بھی بعض قدیم تاریخی روایات میں ہندوستان کا ذکر ملتا ہے۔ ان روایات کے مطابق حضرت نوح کا وطن ہندوستان تھا اور طوفانِ عظیم کے بعد ان کی کشتی ہمالیہ کے بدری (Badri) علاقے میں آ کر ٹھہری۔ برصغیر کے عظیم شاعر اور مفکر علامہ محمد اقبال نے بھی اپنی معروف نظم بانگِ درا میں اسی روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میر اوطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بعض تاریخی روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی کی تعمیر کے لیے جو لکڑی استعمال کی، وہ ہندوستان میں پائے جانے والے آک (Calotropis) سے حاصل کی گئی تھی۔

اس سلسلے میں ایک اور قابل توجہ پہلو رام سیتو ہے، جسے مغربی دنیا میں عموماً آدمز برج (Adam's Bridge) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستان اور سری لنکا کے درمیان چونے کے پتھروں کی قدرتی زنجیر صدیوں سے دو (Limestone Shoals) مختلف مذہبی اور تہذیبی روایتوں کا مرکز رہی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کے دو الگ الگ نام مشہور ہوئے۔

قدیم سنسکرت مہا کاوی رامائن، جسے مہارشی والمیکی سے منسوب کیا جاتا ہے، کے مطابق بھگوان رام نے سری لنکا پہنچ کر سیتا کی بازیابی کے لیے سمندر پر ایک پُل تعمیر کیا۔ روایت کے مطابق انجینئروں کی نگرانی میں وانر سینا نے ایسے پتھروں سے یہ پل بنایا جن پر رام کا نام لکھا جاتا تھا اور وہ پانی پر تیرنے لگتے تھے۔

ہندو مذہبی روایت میں رامیشورم (تمل ناڈو) سے سری لنکا کے منار جزیرے تک پھیلی ہوئی یہی قدرتی چٹانی زنجیر رام سیتو یا رام کا پل کہلاتی ہے۔

دوسری جانب قرونِ وسطیٰ کے متعدد مسلم جغرافیہ نگاروں اور سیاحوں نے اسی قدرتی راستے کو حضرت آدم علیہ السلام کی زمین پر آمد سے جوڑا ہے۔ ان روایات کے مطابق حضرت آدم جنت سے سری لنکا کے اس پہاڑ پر اترے جو آج آدمز پیک (Adam's peak) کے نام سے معروف ہے، اور بعد ازاں اسی قدرتی راستے کے ذریعے سری لنکا سے برصغیر ہند تشریف لائے، یا بعض روایات کے مطابق ہندوستان سے دوبارہ سری لنکا گئے۔

آدمز برج (Adam's Bridge) کی اصطلاح کم و بیش گیارہویں صدی عیسوی میں عظیم مسلم عالم اور جغرافیہ دان ابوریحان البیرونی کے دور میں رائج ہوئی، اور یہ اسی قدیم اسلامی روایت کی عکاس ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت سے نزول کے بعد اس قدرتی راستے کو عبور کیا تھا۔

مذکورہ روایات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے مقامِ نزول کا کوئی صریح ذکر موجود نہیں اور نہ ہی ایسی کوئی صحیح اور قطعی حدیث ملتی ہے جو اس مقام کی واضح تعیین کرتی ہو، تاہم اسلامی تاریخ، تفاسیر اور بعد کی مذہبی روایات میں محفوظ متعدد بیانات حضرت آدم علیہ السلام کے نزول کو برصغیر ہند یا موجودہ سری لنکا سے جوڑتے ہیں۔ ان روایات کی سند، تاریخی حیثیت اور علمی وزن میں یقیناً اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ صدیوں کے دوران ان روایتوں نے برصغیر ہند کی مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی روایت کا ایک اہم حصہ تشکیل دیا ہے۔ یہی روایات اس خطے کو انسانی تاریخ کے اولین باب سے جوڑتی ہیں اور برصغیر ہند کی تاریخی و تہذیبی شناخت کو ایک منفرد معنویت عطا کرتی ہیں۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی *

فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید

ایک بصیرت افروز مقدمہ

نوٹ: زیرِنظر تحریر ممتاز ماہرِ تعلیم، دانش ور، مفکر اور سابق ڈائریکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا وہ بصیرت افروز مقدمہ ہے جو انھوں نے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے عنوان سے شائع ہونے والی کتاب کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ یہ کتاب دسمبر ۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے ایک قومی سیمینار کے منتخب علمی و تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے، جس میں ملک کے ممتاز علماء، مفکرین، اساتذۂ جامعات اور محققین نے اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید، اجتہاد، فقہ، حدیث، علمِ کلام، تہذیب اور معاصر فکری مسائل پر اپنے گراں قدر مقالات پیش کیے۔ یہ مقدمہ محض ایک کتاب کا تعارف نہیں بلکہ

* سابق پروفیسر و ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

اسلامی تہذیب کے تاریخی ارتقا، مسلمانوں کو درپیش فکری و تہذیبی چیلنجوں، اسلامی شریعت کی ابدیت اور اجتہاد کی ضرورت پر ایک نہایت متوازن اور بصیرت افروز علمی گفتگو ہے۔ پروفیسر فاروقی نے واضح کیا ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید سے مراد دین کے بنیادی مصادر میں کسی تبدیلی کا تصور نہیں، بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں بدلتے ہوئے حالات اور نئے مسائل کا ایسا فہم و ادراک ہے جو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ اور عصری تقاضوں سے ہم کنار ہو۔

تقریباً نصف صدی گزر جانے کے باوجود اس مقدمے کی علمی اہمیت اور معنویت برقرار ہے۔ آج جب اسلامی فکر، اجتہاد، روایت اور معاصر چیلنجوں پر بحث پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر چکی ہے، تو یہ مقدمہ اپنے استدلال، اعتدال اور فکری گہرائی کے باعث مزید اہمیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ اسی احساس کے تحت اسلام اور عصرِ جدید اپنے معزز قارئین کی خدمت میں اس مقدمے کو ازسرِ نو پیش کر رہا ہے۔

محمد سعید انور

○

تاریخ اسلام میں منگولوں کی تاخت و تاراج کا عہد بڑا بھیانک عہد ہے۔ سیاسی و معاشی مضمرات سے قطعِ نظر علوم اور تہذیب و تمدن کی بربادی کے لحاظ سے بھی ہماری تاریخ کا یہ ایک المناک اور ناقابلِ فراموش باب ہے۔ علم و دانش کی جیسی تباہی منگولوں کے ہاتھوں ہوئی اس پر آج بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ سیاسی سطح پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیائے اسلام کے کئی علاقوں کا رشتہ ایک دوسرے سے ایک عرصے تک منقطع رہا، لیکن چونکہ اس عہد میں مسلمانوں کی تمدنی و علمی زبان ایک تھی اور ابھی اسلام کی آفاقی روح مسلمانوں کی تمام تمدنی اور علمی سرگرمیوں میں محور کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے اسلام کا تمدنی سرمایہ پوری دنیائے اسلام کا مشترک سرمایہ تھا۔ مسلمان اسے ایسا ہی سمجھتے تھے

اور اس کی حفاظت اور اسے ایک نسل سے دوسری نسل تک دیانت داری سے منتقل کر دینا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے۔ اُس زمانے کے عالموں میں ایسی جامع العلوم ہستیاں بھی تھیں جن کا علم قاموسی علم تھا، جنھیں بیک وقت رائج عقلی اور نقلی علوم پر دسترس حاصل تھی اور جو اسرارِ شریعت کے ساتھ مقاماتِ طریقت سے بھی آشنا تھے، ایسے عالم اور دانشور بھی تھے جو علم کی الگ الگ شاخوں میں ممتاز تھے، لیکن سب کے سب ایک ہی تمدنی وعلمی روایات کے امین تھے اور ان روایات میں زندگی تھی روحِ اسلام کی کارفرمائی سے۔

منگولوں کے بعد مسلمانوں کا بڑا، اہم اور مسلسل تصادم رہا، یوروپ کی ان فوجی، سیاسی، معاشی اور تمدنی قوتوں سے، جو نشاۃ ثانیہ کے عہد سے لے کر صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ تک، کوئی تین سو سال کے عرصے میں پروان چڑھی تھیں اور اب اپنے حدود سے نکل کر دوسرے تمدنوں سے متصادم تھیں۔ اسلامی تمدن کے مرکز اور مسلم علاقے چونکہ یوروپ سے ملحق تھے، بلکہ یوں کہیے کہ وہ مغرب سے اُٹھے اس سیلاب کی راہ میں مزاحم تھے اور اسلامی دُنیا اور عیسائی دنیا کی باہمی آویزش صدیوں پرانی تھی اور تاریخ عالم کی ایک روایت بن گئی تھی، اس لیے مسلمانوں کو اس سیلاب کی اولین اور سخت ترین ضربیں برداشت کرنی تھیں۔ یہ ایک عمل تھا جو اپنی پوری قوت سے کوئی ڈیڑھ دو سو برس تک جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیائے اسلام کا اتحاد ایک حد تک مذہبی اور تہذیبی سطح پر بھی، مغربیت کے اثر سے ٹوٹ کر رہ گیا ہے اور مغربیت اسلامی تمدن کے لیے ایک اجنبی عنصر ہی نہیں بلکہ ایک ایسی دنیا کی ترجمانی ہے جو خود اپنے انتشار اور تضادات کے مہلک روگ میں مبتلا ہے۔

اسلامی دنیا بڑی رنگا رنگ دنیا تھی۔ عرب، ایرانی، ترک، بربر، سیاہ فام افریقی، جنوبی ایشیا کے ہندستانی اور جنوب مشرق میں ملایائی اور انڈونیشی وغیرہ، اپنے اپنے طریقے سے اور کہیں کہیں شریعت کی مخصوص تعبیرات کے ساتھ، اسلام سے تعلق اور محبت کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے اور اس رنگا رنگی میں شریعت کے بنیادی اصول اور زندگی گزارنے کے شرعی رسوم و آداب کے علاوہ تصوف اور صوفی سلسلوں کے اپنے طریقے تھے جو تمدنِ اسلامی کی اساس کو اور مختلف النوع عناصر کو متحد رکھتے تھے۔

مغربی تہذیب یا جدید تمدن نے ایک طرف تو اپنے متاثرین کے ذہنوں میں انتشار اور پراگندگی پیدا کردی اور ان پر اسلام کی گرفت کو کمزور کردیا اور دوسری طرف اسلامی دُنیا کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کردیا کہ اس سے پہلے تاریخ اسلام میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آج علمی اور تہذیبی سطح پر ان مختلف حصوں کے مابین اتنا بھی تعلق نہیں ہے جتنا منگولوں کی تباہ کاریوں کے باوجود قائم تھا۔ دہلی، سمرقند، مراغہ، نیشاپور، اصفہان وشیراز، قونیہ، دمشق، قاہرہ، قیروان، مراکش سب علمی وتہذیبی لحاظ سے ایک دوسرے سے واقف تھے اور اپنے آپ کو ایک کُل کا جزو تصور کرتے تھے، آج اگر یہ تمام علاقے اس کُل کو تلاش کریں یا اسے دوبارہ پیدا کرنا چاہیں تو ناممکن ہے، غالباً وہ اب اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

آج صورت یہ ہے کہ بہت سے تاریخی عوامل، نسلی خصوصیات، داخلی، سماجی اور سیاسی عناصر اور دیگر اسباب کی بنا پر اسلامی دنیا میں زندگی کے ایسے مختلف نمونے ملتے ہیں جن میں فکر وعمل کے جدید (موڈرن) اصولوں اور طریقوں کی پیوندکاری ہے اور اس سے وہ پراگندگی اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے کہ اجنبی تو خیر اجنبی ہے، خود مسلمانوں کے لیے یہ مشکل ہوگیا ہے کہ وہ اسلام کا من حیث الکل احساس یا ادراک کرسکیں۔ پہلے ایسا تھا کہ روایتی تعلیم کے وسیلے سے مسلمانوں کو اپنے علوم اور تمدنی ورثے سے واقفیت حاصل ہو جاتی تھی۔ اس میں دینی علوم کے ساتھ عقلی علوم بھی ہوتے تھے اور نیچرل سائنس، ریاضی اور فقہی علوم بھی، زبان وادب ان کے علاوہ۔ لیکن آج کل تو مدارسِ عربیہ میں بھی اتنا سب کچھ حاصل کرنا مشکل ہوگیا ہے اور اس مسلمان کے لیے تو تقریباً ناممکن ہے جس نے جدید طرز کی تعلیم پائی ہے اور جو اپنے علمی ورثے کے بہت سے بنیادی اجزا سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ دراصل دنیائے اسلام میں موڈرن ازم کے فروغ واشاعت میں اس امر کو بھی بڑا دخل ہے کہ جدید طرز کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد اسلام کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ دیکھنے سے محروم رہی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغرب یا مشرق جس سمت سے بھی نئے چیلنج اور وقت کے نئے تقاضے پیش آئیں تو ان کا جواب عالموں اور دانشوروں کا وہی طبقہ دے سکتا ہے جسے اسلام کے پورے علمی وتمدنی سرمایے پر عبور ہو اور جس کی نظر 'اسلام' پر ایسی ہو کہ اس کا کوئی گوشہ اس سے مستور نہ رہے۔

دسمبر ۱۹۷۶ء کے آخری دنوں میں (۲۶/تا ۲۹/دسمبر) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی

ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے زیرِ اہتمام فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کے مسئلے پر جو سیمینار ہوا، اس کا مقصد جہاں یہ تھا کہ ایک جدید علم کلام کی ضرورت اہمیت اور 'اجتہاد' کے نظریے کی عملیت و حرکیت کی طرف عالموں اور دانشوروں کی توجہ ایک بار پھر مبذول کرائی جائے، وہاں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس امکان کا جائزہ لیا جائے کہ کیا علماء اور دانشوروں کی کوئی ایسی جماعت بن سکتی ہے جو اس اہم مسئلے کا بارگراں اُٹھانے اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے تیار ہو۔

بعض حضرات تھے جنھوں نے موضوع سیمینار میں 'تشکیل' کے لفظ کو محلِ نظر سمجھا اور سوال کیا کہ تشکیل جدید کا آخر کیا مطلب ہے؟ کیا ایک نیا اسلام (معاذ اللہ) بنانا مقصود ہے؟ ہمارے ذہنوں میں اس طرح کا کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور فکرِ اسلامی سے ہماری مُراد دین اسلام ہرگز نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ ہماری مراد اس سے الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید تھی، یعنی ایک جدید علم کلام کی ضرورت کا ایک بار پھر احساس دلانا تھا۔ اس لیے جن ''متشککین'' نے تشکیل کے بجائے 'تعبیر' کے لفظ کو مناسب سمجھا ہم نے اُن سے کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ گفتگو کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک جدید علم کلام کی ضرورت و اہمیت کا انھیں بھی شدید احساس ہے۔ اس پر بھی جدید و قدیم دونوں حلقوں کے لوگ متفق تھے کہ مفکرینِ اسلام، فقہاء اور مجتہدین نے ہمیشہ زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے اور آج بھی کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور ان کا قابلِ قبول حل تلاش کرنا ہے۔ لیکن اختلاف رائے ان امور میں ظاہر ہوا، اور جیسا کہ ہمیشہ ایسے اجتماعات میں دیکھنے میں آیا ہے اور بہت سے مقالے اور کتابیں بھی اس سلسلے میں لکھی جا چکی ہیں کہ جدید دور کے تقاضوں سے ہماری مراد کیا ہے؟ تقلید سے متعلق ہمارا موقف کیا رہا ہے، کیوں رہا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟ مختلف مذاہب فقہ میں اسلامی قانون سازی کے جو اصول رہے ہیں، ان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ دورِ حاضر کی اجتماعی و علمی تبدیلیوں کے پیشِ نظر اجماع اور قیاس کی کسی نئی تعبیر اور ان کے مفہوم میں مزید توسیع کی گنجائش ہے یا نہیں؟ وجوب اجتہاد تو ظاہر و باہر ہے لیکن اجتہاد کی شرطیں کیا ہیں اور مجتہد میں کن مخصوص صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟

ہماری رائے میں یہ بات بے سبب اور کچھ ایسی بے جا نہ تھی کہ تاریخ اسلام کے ایک خاص دور میں علمائے اہلِ سنت نے مذہب میں بے جا قطع و برید کے خوف سے عملی طور پر باتفاق رائے

اجتہاد کے موقوف کرنے اور صرف چار مذاہب کا اتباع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایسا نہ ہوتا تو مسلم معاشرہ میں سخت انتشار پیدا ہو جاتا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اُس خاص دور میں پورے معاشرہ پر ایک طرح کا جمود ہی طاری تھا، معاشی و معاشرتی سطح پر کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی اور سیاست بھی ایک خاص نہج پر چل رہی تھی۔ مزید برآں مختلف فقہی مذاہب کے مدون و منضبط ہو جانے کے بعد پہلے کی بہ نسبت اجتہاد کی گنجایش بھی بہت کم رہ گئی تھی کیونکہ سابق مجتہدین نے تقریباً ہر قسم کے مسائل و مقدمات پر غور وفکر کر کے دلائل و براہین کے ساتھ اپنی رائے پیش کی تھی اور اپنے مذہب کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے **حجتہ اللّٰہ البالغہ** میں تقلید کے کئی اسباب بتائے ہیں، چوتھی صدی ہجری سے دنیائے اسلام میں، خاص طور سے مشرقی دنیائے اسلام میں بغداد اور خراسان کے مختلف مذاہب فقہ کے ماننے والوں میں نزاع و اختلاف کی فضا پیدا ہوگئی اور مجادلہ و مناظرہ کا وہ بازار گرم ہوا کہ اصل اسلام اس بات پر منحصر ہو کر رہ گیا کہ مذاہب شافعی اور ابوحنیفہ میں کون اولیٰ اور افضل ہے۔ دوسری طرف یہ صورت بھی تھی کہ سلاطین و امرا کے درباروں سے وابستہ اکثر علماء و فقہاء کے یہاں امانت و دیانت کا وہ معیار باقی نہیں رہا تھا جو پہلوں کے یہاں تھا، شاہ صاحب ان امور کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تقلید کی ایک خاص وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب اکثر لوگ فنون کی باریکیوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور مسائل کے ایسے مستبعد مفروضات کی تلاش کرنے لگے جو عقل سلیم کے لیے بار اور ناقابلِ التفات ہوتو 'جدل و خلاف و تعمق' کے مضرت رساں نتائج اسی طرح انتشار کی صورت میں ظاہر ہونے لگے جیسے کہ سیاسی سطح پر فتنہ و فساد کے سبب انجام کار ظالم حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ بس یہیں سے تقلید کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تقلید کے یہ زمانے خوش آئند نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن تقلید کے جو اسباب بتائے گئے ہیں ان کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ علماء اہلِ سنت چار منضبط مذاہب کے اتباع کا فیصلہ کرلیں اور عارضی طور پر اجتہاد کا دروازہ بند سمجھ کر معاشرتی و تمدنی سطح پر دنیائے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بچالیں۔

مخصوص حالات میں تقلید کی ضرورت کے پیش نظر فقہا نے دو برائیوں میں جو اہون تھی اس کو اختیار کیا تھا اور ملحدانہ اجتہاد اور ضلالت و بے راہ روی کے مقابلے میں تقلید اور تقلید کی قباحتوں کو ترجیح دی

تھی۔ لیکن ہمارے خیال میں تقلید کی گراں باریاں ایک خاص عہد میں ایک مخصوص طرز کی سماج ہی برداشت کرسکتی تھی، جیسے ہی وہ عہد ختم ہوا اور انسانی زندگی کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ڈھانچے بدلے اور سماج میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو ضرورت تھی کہ ہم اپنے سماجی روایت اور معاشی اداروں کا جائزہ لیتے اور دیکھتے کہ بدلے ہوئے حالات میں ان اداروں میں کہاں تک ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ شریعت اسلامی میں اندھی تقلید جائز نہیں۔ قرآن کریم نے احکام شرع پر غور و خوض کرنے اور اختلافی مسائل میں اصل کی طرف رجوع کرنے کو واجب قرار دیا ہے، سنت نبوی اور آثار و اجماع صحابہؓ بھی اس باب میں یہی ہے اور ائمہ اربعہ کے اقوال بھی اجتہاد کے حق میں ہیں، چنانچہ ابن قیم نے ابوحنیفہ اور ابو یوسف سے روایت کی کہ انھوں نے کہا: ''کسی کو جائز نہیں کہ ہمارے قول کی پیروی کرے جب تک کہ وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے کس بنا پر کہا۔'' بن عیسیٰ سے روایت ہے کہ انھوں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے سنا کہ بے شک میں انسان ہوں۔ غلطی بھی کرسکتا ہوں اور صحیح فیصلہ بھی۔ میری رائے پر غور کیا کرو۔ پس جو رائے کتاب وسنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرو اور جو رائے کتاب وسنت کے خلاف ہو اُسے چھوڑ دو۔ اسی بنا پر امام مالکؒ نے خلیفہ ہارون رشیدؒ کو اس بات سے روکا تھا کہ وہ لوگوں کو مالکی مذہب اختیار کرنے کی ترغیب دیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اسی طرح اندھا دھند اپنی تقلید سے منع کیا ہے۔ امام احمدؒ نے جو رائے وقیاس کے معاملے میں زیادہ سخت ہیں، بڑے پرزور الفاظ میں کہا ہے: ''نہ میری تقلید کرو، نہ مالک کی، نہ شافعی کی، نہ ثوری کی بلکہ انھیں ماخذوں کو پیشِ نظر رکھو جو ان کے پیشِ نظر تھے۔''

اس طرح ائمہ مجتہدین اور بیش تر فقہاء کا منشا یہ تھا کہ لوگوں کو اپنا ذہن کھلا رکھنا چاہیے اور جس بات پر ان کا قلب مطمئن ہو اسی کو تسلیم کرنا چاہیے۔ مقاصدِ شریعت میں دو قسم کے مسائل آتے ہیں، ایک عبادات اور دوسرے معاملات دنیوی اور یہاں عبادات سے نہیں بلکہ معاملات سے بحث ہے۔ دنیاوی معاملات میں وہی اصول معقول، قابل قبول اور بر بنائے انصاف سمجھا جائے گا جس سے لوگوں کو نفع پہنچے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیاوی معاملات اس اصول پر مبنی ہیں کہ نفع دینے والی چیزیں مباح ہیں اور نقصان دینے والی ممنوع۔ چند علماء ہیں جو عبادات و معاملات دونوں کو امر تعبدی قرار دیتے ہیں لیکن یہ وہ ہیں جو لفظ پرست ہیں اور عقل انسانی کو وہ مقام نہیں دیتے جو خدا کی طرف

سے اسے ملا ہوا ہے۔

مقاصدِ شریعت کے بارے میں ابن قیم نے بڑی متوازن اور معقول بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت کی بنیاد حکمتوں اور لوگوں کی دنیاوی اور اخروی فلاح و بہبود پر ہے اور شرع کل کی کل انصاف ہے، سراسر رحمت اور حکمت ہے، پس جس مسئلے میں انصاف کی بجائے ظلم ہو، رحمت کی بجائے زحمت ہو، فائدے کی بجائے نقصان ہو اور عقل کی بجائے بے عقلی ہو وہ شریعت کا مسئلہ نہیں، اگر چہ اسے بذریعہ تاویل شرع میں داخل کر لیا گیا ہو۔ پس شریعت خدا کے بندوں میں اس کا انصاف ہے اور اس کی مخلوق میں اس کی رحمت، اسی سے زندگی ہے، غذا ہے، دوا ہے، نور ہے، شفا ہے اور حفاظت ہے۔ زندگی کی ہر بھلائی شریعت سے وابستہ ہے اور زندگی کے ہر نقصان کا سبب ترک شریعت ہے...... چنانچہ جو شریعت خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائی ہے وہ عالم کا ستون اور دنیا و آخرت کے تمام حلقہ ہائے فلاح و بہبود کا مرکز ہے۔ خدا کا طریقہ جو اس کے بندوں میں ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا، یہ ہے کہ دنیا کے حالات اور اقوام عالم کی عادات ہمیشہ ایک حالت پر باقی نہیں رہتیں اور یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں تبدیلیوں کے ساتھ انسانوں کی فلاح و بہبود کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔ علامہ ابن قیم نے اس حقیقت کو اپنے خاص اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''معاشرہ انسانی اور قانون کا باہمی رشتہ نہ جاننے کے باعث لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے جس نے شریعت اسلامی کا دائرہ بالکل محدود کر دیا ہے، حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جس شریعت میں مصالح انسانی کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو اس میں ایسی تنگ نظریوں کی گنجائش نہیں۔''
>
> (صبحی محمصانی، فلسفۂ شریعت اسلام، مجلس ترقی ادب [لاہور] صفحات: ۱۶۴-۱۶۵، بحوالہ ابن قیم، اعلام الموقعین، جلد:۳)

اب جب کہ مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو چکی کہ فکر اسلامی کی تعبیر جدید ہو یا کسی جدید علم کلام کی تشکیل، یا احکام کی نئی وضاحت یا تبدیلی[۱] اسلام کا کوئی اصول اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں

[۱] یہاں احکام کی تبدیلی سے مراد خدانخواستہ نصوص کی تبدیلی نہیں کیونکہ ایسا کرنا گویا اسلام ہی سے دستبردار ہونے کے مرادف ہوگا۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کی ضرورت کی بنا پر یا علت و عادات کے بدل جانے سے نصوص کی ضروری تغییر اور تشریح معہ تمام شرائط دینیہ کے لازم سمجھی جائے۔

(بشرطیکہ یہ سب کچھ کتاب وسنت کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات اسلامی کی اصل روح کے مطابق ہو) تو مستشرقین اور اُن کے بعض مسلم تلامذہ کی اس کج اندیشی کا پردہ فاش ہو جاتا ہے کہ شرع اسلامی ایک جامد قانون ہے اور اس سے عصر حاضر کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ ہمارے خیال میں ان کی کج اندیشی کا سبب ان کی تنقیدی درماندگی اور شرع اسلامی کے ماخذوں سے لاعلمی ہے۔ نیز وہ شرع اسلامی کا حقیقی منشا سمجھنے سے بھی قاصر رہے ہیں۔

معاشرۂ انسانی، قانون اور اخلاقی اقدار میں ایک ایسا رشتہ ہے جس کے توازن میں اگر کچھ گڑ بڑ ہو جائے تو برائیوں کے نت نئے دروازے کھل جاتے ہیں، اسلام کی روح اعتدال وتوازن کو اس رشتے کی استواری کے لیے نہایت اہم قرار دیتی ہے اور سچی اسلامی زندگی وہی ہے جس میں عدل واحسان اعمال کی بنیادی قدریں قرار پائیں اور اجتہاد ہی وہ طریقہ کار ہے جو اس استواری کو برقرار اور اسلام کی ہیئت ترکیبی میں عدل واحسان کو معیار فکر وعمل بنا کر حرکیت کو قائم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرع اسلامی اپنے تمام تاریخی ادوار میں معاشرہ انسانی کے نشو وارتقا میں کبھی سدِ راہ نہیں ہوئی۔ شرع اسلامی کو نشیط اور تازہ کار رکھنے کے لیے باہمت اور عزم صمیم رکھنے والے فقہاء ومجتہدین پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے شریعت کی منشا کو سمجھا اور اس کے مقصد اصلی کو پیش نظر رکھ کر ایسے زمانے میں اُسے رواج دیا جب لوگوں پر جمود طاری نہ تھا اور زمانہ ہر فن کے صاحبِ نظر حضرات سے معمور تھا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام میں زندگی کے ہر ہر گوشے سے متعلق ہدایات ہیں، یہ منشا ہرگز نہیں ہوتا کہ جس وقت **اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ** والی آیت حضور پر نازل ہوئی، بس وقت کی رفتار وہیں رک گئی اور انسانی معاشرہ جیسا کہ اُس وقت تھا جامد ہو کر رہ گیا۔ ایسا سوچنا قرآنی تعلیم کے منافی ہوگا اس لیے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی علامت ونشانی ٹھہرایا ہے۔ اس لیے مکمل دین کہنے سے مراد صرف یہ ہے کہ تغیر و تبدل کی جو صورت بھی ہو اور جس زمانے میں بھی ہو، اسلام ان سب حالات میں صحیح صحیح رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں وہیں سے فیضان حاصل کرنا چاہیے۔ اسلام زمانے کی رفتار کو نہیں روکتا اور چاہتا ہے کہ معاشرہ میں ضروری اصلاح وتجدید سے کام لے کر زندگی کو مفید اور بامقصد بنایا جائے۔ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ فکر

وعمل کی ہر تبدیلی کے باوجود معاشرہ میں توازن، سلامتی اور داخلی وخارجی امن وطمانیت کی فضا اگر پیدا کی جاسکتی ہے تو اسی کے پیغام پر عمل پیرا ہوکر۔

پس یہ ثابت ہے کہ اسلام ایسا دین ہے جو کسی ایک زمانے تک محدود نہیں، جو تغیر کو آیت الٰہی کہتا ہے اور جو قرآن کی اس آیت: **اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا** کے ذریعے ہر لمحہ اور ہر آن اس امر کی ترغیب دیتا ہے کہ لوگ مشیتِ الٰہی کے مضمرات جو لا متناہی ہیں اور جن کا تعلق انسانی زندگی سے بھی ہے سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں تا کہ کتاب وسنت کے عمومات سے زندہ اور کار آمد اصول دریافت کرنے کا سلسلہ جاری رہے اور وقت کی مناسب جزئیات پر ان کا اطلاق کیا جاتا رہے۔ یہ ایک جہد مسلسل ہے اور مسلمانوں کو اس کی دعوت دی گئی ہے تا کہ مدنیت اور ارتقا کا عمل اسی نہج پر جاری رہے جسے قرآن کریم نے 'صراط مستقیم' کہا ہے، یعنی ایسے لوگوں کا راستہ جن پر اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنا فضل وانعام فرمایا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو آج اسلامی قانون سازی، فکر اسلامی کی تعبیر جدید یا فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ مہتم بالشان کام انجام دے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجتہاد کے عمل کے لیے ہر شخص موزوں نہیں ہوسکتا اور نہ ہر شخص کو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اصول کی کتابوں میں اجتہاد کی شرطیں یعنی مجتہد میں کیا کیا صلاحیتیں ہونی چاہیں وضاحت سے مذکور ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی اپنے رسالے **عقد الجید فی احکام الاجتهاد و التقلید** میں اس مسئلے کو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ مجتہد کے لیے قرآن وحدیث کے ان نصوص کا علم ضروری ہے جو احکام سے متعلق ہیں۔ احادیث کے سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ کتب حدیث کی ترتیب کیا ہے اور اس فن کی اصطلاحات کیا ہیں، اصول حدیث سے بھی پوری واقفیت ہونی چاہیے۔ مجتہد کو صاحب نظر ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ وہ اجماع کے موقعوں اور ان کی نزاکتوں کا علم رکھے۔ یہاں نظر کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ قیاس کے مقدمات کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ نتیجہ صحیح نکلے۔ اسی کے تحت اس بات کا علم بھی آتا ہے کہ علماء سلف کن امور میں متفق تھے اور کن امور میں ان میں اختلاف تھا۔ اجتہاد کے لیے نہایت ضروری ہے کہ عربی زبان وادب کا اچھا علم اور ذوق ہو۔ زبان ادائے مطلب کے لیے اپنا مخصوص سانچہ اور مزاج رکھتی ہے۔ عربی زبان کا بھی اپنا ایک مخصوص اسلوب اور مزاج ہے اس کے اسرار ورموز سے واقفیت اجتہاد کی

بنیادی شرط ہے۔ کیسی حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو بغیر عربی جانے اجتہاد کا مشغلہ فرماتے ہیں۔ اصولِ فقہ پر بھی نظر ہونی چاہیے، اسی کے ساتھ تاریخ فقہ، راویوں کے حال، ائمہ ومجتہدین کے مسلک ودلائل سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ ناسخ ومنسوخ کا علم بھی نہایت ضروری ہے۔ اجتہاد کے لیے لازم ہے کہ اجتہاد کرنے والا جدید طرزِ زندگی سے بھی واقفیت رکھتا ہو، وہ یہ بھی جانتا ہو کہ وہ کون سے معاشی، سیاسی اور عمرانی عوامل ہیں جن سے معاشرہ متاثر ہوتا ہے اور نئے مسائل اپنی مختلف جہتوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور یہ کہ مجتہد غیر معمولی ذہنی سلجھاؤ رکھتا ہو، دیانت وامانت کا حامل ہو، صائب الرائے ہو، صاحب فراست ہو، مقاصد شریعت کی فہم اور اخلاقی جرأت رکھتا ہو۔ یہ خوبیاں نہ ہوں تو کتاب وسنت اور عربیت وغیرہ علوم کے حاصل ہونے کے باوجود کسی کو اجتہاد کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ ایک زمانہ اسلام پر ایسا بھی گزرا ہے جب دنیا نے مختلف سطحوں پر اپنا جال بچھا رکھا تھا، اقتدار کی خواہش، دولت کی ہوس، تدین کا فقدان، عقل کے فتنے، عقیدوں کی بے راہ روی، سلاطین کا جبر واستبداد، یہ سب دنیا کے جال ہی تھے۔ اُس وقت یہی مفید تھا کہ تقلید ہی کو شعار بنالیا جائے اور اس وقت کے حالات میں اس میں کوئی خاص نقصان بھی نہیں تھا، زندگی تقلید کا بارگراں اُٹھا سکتی تھی۔ لیکن آج ایک طرف تو اس طرح کی تقلید سے کام نہیں چل سکتا اور دوسری طرف دنیا کا حال اُس زمانے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پیچیدہ اور ابتر ہے۔ اس لیے کسی ایسے شخص کی تلاش جو اجتہاد کی مذکورہ تمام شرطوں کو پورا کرتا ہو، غالباً نتیجہ خیز نہ ہوگی، یہ عہد علم وفن کی دنیا میں تخصص کا عہد ہے اور بہت سے نئے علوم وجود میں آگئے ہیں اور دینی مدرسوں اور جدید درس گاہوں سے آج ایسے رجال کار نہیں نکل رہے ہیں جو بیک وقت قدیم وجدید علوم میں رسوخ رکھتے ہوں۔ اس لیے اگر کسی اکیڈمی یا ادارے کے زیرِ اہتمام علماء اور جدید طرز کی تعلیم پائے ہوئے دانشور دونوں مل کر اس کام کو ہاتھ میں لیں تو ممکن ہے کہ اس ادارے کے اجتماعی ضمیر میں ایسی قوت اور اس کے اراکین کی مشترک کوششوں میں ایسی برکت پیدا ہوجائے کہ رفتہ رفتہ وقت کی یہ مشکل آسان ہوجائے۔

اجتہاد کے عمل سے فقہ جدید کی تدوین کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ فقہ سے متعلق تمام ذخیرے پر تحقیقی نظر ڈالی جائے اور مسائل اور فروع کے بے پناہ انبار میں سے ان کی اصل بنیادوں اور ماخذ واصول کا پتہ لگایا جائے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقہ کے تاریخی ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے۔

البتہ اس پر اس انداز سے نظر ڈالی جائے کہ شریعت میں کن کن مصالح کی رعایت رکھی گئی ہے اور ہمارے فقہا نے استخراج واستنباط اور استدلال وقیاس کے سلسلے میں کن خارجی مآخذ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ان قواعد عامہ وکلیات کا جائزہ لیا جائے جن کو فقہا اپنی کتابوں میں مسائل کے اثبات وتردید کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ موجود فقہی اہمیت کے اصول وقواعد کے ساتھ یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں کس قدر توسیع واضافے کی گنجائش ہے۔ اس طرح ماضی سے تسلسل بھی قائم رہے گا اور کچھ نئے اصول ومعیار بھی ہاتھ آجائیں گے جن سے جدید مسئلوں کے حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی *

اسلام دین رحمت ہے

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کی اصلاح وہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں، جنھوں نے انھیں اللہ کی اطاعت وبندگی کی دعوت دے کران کے اعمال واخلاق کوسدھارااور سنوارااور انھیں دینی ودنیوی فلاح وسعادت کا راستہ بتایا، اس لحاظ سے دنیا کے تمام مذاہب انسانوں کے لیے رحمت ہیں لیکن انسانیت کے ابتدائی دور میں ان مذاہب کا کوئی عالم گیر تصور نہ تھااور خدا کے بندے ملکی وجغرافیائی اورنسلی وقبائلی حد بندیوں میں منقسم تھے، اس لیے اس زمانے کے مذاہب اور پیغمبروں نے خاص خاص قوموں ہی کی اصلاح وہدایت کی اوران کی تعلیمات بھی اسی زمانے کے انسانوں کی عقل وشعوراور زندگی کی ضرورتوں کے مطابق سادہ، محدوداور کچھ اخلاقی ہدایتوں پر مشتمل تھیں اس لیے ان کی رحمت کا دائرہ محدود تھا لیکن جس قدر زمانہ گزرتا گیا، انسانوں کی عقل وفہم ترقی کرتی گئیں اور زندگی کی ضرورتیں وسیع اور مسائل پیچیدہ ہوتے گئے، اسی نسبت سے اس دور کے مذاہب میں وسعت اور گہرائی آتی گئی۔

اسلام مذاہب کے سلسلے کی آخری کڑی اور انسانوں کے عقلی بلوغ اور تمدنی ترقی کے دور کا مذہب ہے، اس لیے اس کی تعلیمات میں بڑی وسعت، ہمہ گیری اور جامعیت ہے، چنانچہ قرآن مجید

* سابق ایڈیٹر ماہنامہ: معارف، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

نے یہ خدائی اعلان کیا کہ ''اب میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔''[۱]

اور اِس آخری دور کے پیغمبر کے متعلق بتایا کہ ''وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں''[۲] اس بنا پر اسلام ابد تک کے لیے تمام اخلاقی و روحانی اور مادی و دنیاوی ضرورتوں کا مکمل اور جامع اصول حیات ہے، اس کے فیضان سے آبی و خاکی کوئی محروم نہیں اور انسان ہی نہیں حیوانات و نباتات کے لیے بھی اس کا رحم و کرم عام ہے، اس کے مخاطب صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ سارے جن و انس ہیں، اسلام کا خداوند ساری دنیا اور مشرق و مغرب کا خداوند ہے، وہ **رب العالمین**، **رب السمٰوات و الارض** اور **رب المشارق و المغارب** ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنی قوم، اپنے خاندان اور اپنے ملک کے لیے رسول بن کر نہیں آئے تھے بلکہ تمام اقوام اور ساری دنیا کے لیے ہادی اور رہنما بن کر آئے تھے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

> ''اور اے محمد ہم نے تم کو سارے لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اس بات کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔''[۳]

دوسری جگہ ہے:

> ''اے نبی کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں، اس اللہ کا جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔''[۴]

اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> ''ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام سرخ و سیاہ قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔''[۵]

خدا کی سب سے بڑی رحمت و نعمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے:

> ''اور ہم نے تم کو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''[۶]

خدا کی صفات میں سب سے نمایاں صفت رحمان اور رحیم ہے، قرآن مجید کے شروع ہی میں اللہ کے اسم ذات کے بعد ان ہی دونوں کا ذکر ہے جس سے رحمت کی شدت و قوت کے ساتھ وسعت کا

اظہار مقصود ہے۔ کیوں کہ رحمان مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا خاصہ شدت قوت یعنی رحمت کا انتہائی اور آخری درجہ ہے، اسی لیے اللہ کی طرح رحمٰن کا اطلاق کسی شخص پر نہیں کیا جاتا۔ رحیم فعیل کے وزن پر ہے، اس کا خاصہ دوام، استمرار، تسلسل اور کثرت ہے یعنی خدا کی رحمت برابر ہوتی رہتی ہے، اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ خدا کے رحمان ورحیم ہونا کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت شدت وقوت اور زیادتی اور تسلسل دونوں حیثیتوں سے بے پایاں اور غیر متناہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ ”خداوند! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔“[۷]

قرآن مجید میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”خدا نے اپنے اوپر رحمت کو فرض کرلیا ہے۔“[۸] قرآن مجید میں رحمت کے کئی اور مشتقات استعمال ہوئے ہیں خدا نے اپنے کو ذو رحمۃ، ارحم الراحمین اور خیر الراحمین وغیرہ کہا ہے، اسی طرح رحمت کے کئی ہم معنی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً: غفور، **ذو مغفرۃ، شفیق، رؤف اور تواب** وغیرہ اور بار بار تاکید کی گئی ہے کہ خدا کے بندوں کو اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔ (اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ) اردو کے ایک شاعر نشور واحدی مرحوم نے کہا ہے:

ہے میرے گناہوں پر رحمت کی گھٹا چھائی
کیا جانیے قدرت کو کیا بات پسند آئی

بہ کثرت حدیثوں میں بھی اللہ کی رحمت، شان کریمی، بخشش، عفوودرگزر اور مغفرت کا ذکر ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا باب رحمت ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور جس کو اللہ نے رحمۃ العالمین بنا کر بھیجا تھا اس کی ذات بھی سراپا رحمت وشفقت تھی، جو گناہ بندوں سے متعلق نہیں ہوتے اور جن کا عام اعلان واشتہار نہ ہوا ہوتا اور گناہ گار کو اس پر ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے اس سے آپؐ چشم پوشی کرلیتے تھے۔ ایک شخص آپؐ سے آکر کہتا ہے: اے اللہ کے رسول میں نے سزا کے قابل گناہ کیا ہے۔ آپؐ مجھ پر حد جاری کیجیے مگر آپؐ کوئی توجہ نہیں فرمائی، نماز کا وقت تھا نماز پڑھنے چلے گئے۔ اس شخص نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی، نماز ختم ہونے کے بعد اس نے پھر وہی بات دہرائی، آپ نے دریافت کیا تم نے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کی؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا جاؤ تمہارا گناہ خدا نے معاف کردیا۔[۹]

لیکن گناہ کا صریح اقرار واعتراف کرلینے اور اس کا عام اعلان ہوجانے اور اس میں کسی

تاویل کی گنجائش نہ رہ جانے کے بعد آپ لوگوں کو بھی سزائیں دلاتے تھے مگر گناہ گاروں کے لیے کلمات خیر بھی فرماتے تھے۔ غور کیجیے تو سزا دینا بھی رحمت ہی ہے کیوں کہ اس سے برائیوں کا خاتمہ ہوتا ہے، ماحول پاکیزہ ہوتا ہے، معاشرے کی اصلاح اور تطہیر ہوتی ہے، عدل وحق کا تقاضا پورا ہوتا ہے، خرابی متعدی نہیں ہوتی۔

انسانوں پر اسلام کی اس رحمت عام اور عظیم احسانات کے کچھ پہلو یہاں دکھائے جاتے ہیں:

دراصل رحمت کی دو قسمیں ہیں ایک تو ظاہری اور بدیہی جو ہر شخص کو نظر آتی اور محسوس ہوتی ہے مثلاً: عدل وانصاف، انسان دوستی، اخوت ومساوات، خدمتِ خلق اور لوگوں کے حقوق کی ادائیگی وغیرہ لیکن دوسری قسم داخلی اور لغوی ہے جیسے توحید ورسالت اور آخرت کا عقیدہ حق کو عام طور پر لوگ محسوس نہیں کرتے اور انھیں سرے سے رحمت مانتے ہی نہیں حالاں کہ یہ اپنے نتائج کے لحاظ سے سراسر رحمت ہیں، کیوں کہ توحید سے انسان کی عظمت ووقار میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے امر آخرت کے عقیدے سے برائیوں اور فساد وبگاڑ کا خاتمہ ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسان نے خدا کو پہچانا اور اخلاق وروحانیت کی وہ دولت پائی جس کی روشنی سے آج بھی دنیا جگمگا رہی ہے۔

دین اسلام کی سب سے بڑی رحمت توحید خالص ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف خدا ہی کو مالک وحاکم، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھے اور کسی کو نفع ونقصان دینے والا نہ سمجھے، یہ تصور انسانی عظمت وشرف کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد غلامی وبندگی کا کوئی قلادہ اس کی گردن میں نہیں رہ جاتا کیوں کہ خدا کے سامنے دنیا کی ساری مخلوق اور بڑی سی بڑی طاقت یہاں تک کہ ولی وبزرگ اور پیغمبر اور اوتار بھی عاجز ودرماندہ ہیں، موت وحیات، صحت وبیماری، عزت وذلت، نفع ونقصان سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے، قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی سب کا خالق ومالک اور روزی رساں ہے، آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، سب کا وہ پروردگار ہے اور سب اس کے تابع فرمان ہیں، ساری نعمتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں، اس کے علاوہ کوئی عبادت واطاعت کے لائق نہیں، وہ سب کی دعا اور پکار سنتا ہے اور سب کا مددگار ہے۔ کائنات کی ساری چیزیں جو بہ ظاہر بہت عظیم معلوم ہوتی ہیں سب خدا کی مخلوق اور اس کی نشانی ہیں، انسان خواہ کتنا ہی مقدس اور برگزیدہ ہو، ولی اور پیغمبر کیوں نہ ہو وہ بھی عام لوگوں کی طرح مخلوق ہے اور خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا، اس لیے ان کی

بندگی اور پوجا نہیں کی جاسکتی، اسلام کے خدا سے قربت اور نجات ومغفرت کے لیے کسی بزرگ، ولی اور رشی منی کے وسیلے اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسلام میں انسان کا تعلق خدا سے براہِ راست ہے، اس سے اپنا تعلق خود قائم کر کے اس تک پہنچ سکتا ہے اور اپنے ایمان وعمل کے ذریعہ خدا کا مقرب بندہ بن سکتا ہے۔ اس تصور کی وجہ سے اسلام پر کسی طبقہ کی اجارہ داری نہیں رہ جاتی اور انسان میں یہ خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر صرف طلب صادق اور عمل کا ولولہ ہونا چاہیے، ہر آدمی خدا کو پکار سکتا ہے اور وہ اس کی پکار سنتا ہے، ہر شخص براہِ راست اعمال کا مکلّف اور ان کے نتائج کا ذمہ دار ہے، کوئی آدمی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

اس تصور وعقیدہ کا لازمی نتیجہ انسان کی عظمت وفضیلت ہے، اسلام نے اسی لیے انسان کو سب سے اعلیٰ اور برتر مخلوق قرار دیا ہے، قرآن مجید میں انسانی عظمت وکرامت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

> ''ہم نے بنی آدم کو عزت وکرامت بخشی، اور خشکی وتری کی سواری عطا کی اور اس کے کھانے کو پاکیزہ چیزیں دیں اور اس کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت وبرتری عطا کی۔''[۱۰]

قرآن میں ہے کہ اس کے سر پر نیابت الٰہی کا تاج رکھا گیا اور اسے مسجود وملائک بنایا گیا، یہ پوری کائنات اور آسمان وزمین کے درمیان کی چیزیں اس کے تصرف، استعمال اور آسائش کے لیے بنائی گئی ہیں، اقبال نے کہا ہے:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

رحمت کے یہی جلوے دوسرے اسلامی عقاید میں بھی ہیں۔

اسلام کی رحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے طبقہ واریت اور رنگ ونسل، حسب ونسب

اور قوم و وطن کے تفرقے مٹا دیے، دولت و ثروت اور عہدوں اور پیشوں کی بنیاد پر جو فرق و امتیاز قائم کرلیا گیا تھا اس کا خاتمہ کر دیا اور وحدت آدم کا سبق پڑھایا، خدا کے خوف، اخلاق و کردار اور حسن عمل کو معیار فضل و شرف بتایا اور کہا کہ ”تم میں خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پاک باز ہے۔“ خاندانوں اور قبائل کی تقسیم، تعارف اور پہچان کے لیے ہے[۱۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا کہ ”اے لوگو! تمہارا خداوند ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاک باز ہے، کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت ہے سوائے دین اور تقویٰ کے۔[۱۲] آپ نے جاہلیت کے غرور اور آبا واجداد پر فخر کی ممانعت فرمائی ہے۔[۱۳] آں حضرت صلی علیہ وسلم اپنے لیے کوئی امتیاز اور برتری پسند نہیں کرتے تھے، صحابہ کرام آپ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ اس سے منع فرماتے اور کہتے کہ اہلِ عجم کی طرح کسی کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔[۱۴] آپ صحابہ کے مجمع میں اس طرح گھل مل کر بیٹھتے تھے کہ اجنبی آدمی آپ کو پہچان نہیں سکتا تھے، مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی وہیں بیٹھ جاتے، لوگوں کو پھاند کر آگے نہ بڑھتے۔[۱۵]

سفر میں ایک مرتبہ صحابہ کرام نے کھانا پکانے کا سامان کیا اور سب نے ایک ایک کام اپنے ذمہ لیا، رسول اللہؐ نے لکڑی لانا اپنے ذمہ لیا تو صحابہ نے کہا یہ کام بھی ہم لوگ کر دیں گے، فرمایا لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنے کو تم سے ممتاز کروں، خدا اس کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ساتھیوں میں ممتاز بنتا ہے۔[۱۶]

جب لوگ آپ کا نام و لقب بڑھا چڑھا کر لیتے تھے تو آپ فرماتے میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، خدا نے مجھ کو جو درجہ دیا ہے، میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ کو اس سے بڑھاؤ۔[۱۷]

آپ کی تعلیم سے غلام و آقا اور ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق مٹ گیا اور آپ نے سب کو برابر کے درجے میں رکھا، حضرت بلال، حضرت سلیمان اور حضرت صہیب مختلف قوموں اور نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور غلام تھے لیکن شرفائے قریش کے ہم سر اور اپنے تقویٰ کی بنا پر بہتوں سے بہتر قرار پائے۔ اعلیٰ

طبقے کے لوگ ادنیٰ طبقوں سے شادی بیاہ کرنے میں عار محسوس کرتے تھے مگر رسول اللہ نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی حضرت زید بن حارثہ سے کی جو آپ کے غلام تھے، ان کو اپنی فوج کا سربراہ بنایا۔

خلفائے راشدین بھی اسی برابری اور مساوات کو اختیار کیے ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جبلہ بن ایہم مسلمان ہوا، وہ شام کا رئیس اور فرماں روا تھا، ایک مرتبہ خانہ کعبہ کے طواف میں اس کی چادر کا کونا ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا اور حضرت عمر سے اس کی شکایت کی، انھوں نے فرمایا کہ اس میں شکایت کی کیا بات؟ جیسا تم نے کیا ویسا تم کو بدلا ملا، وہ یہ جواب سن کر بڑا متحیر ہوا اور بولا ہم تو اس رتبے کے لوگ ہیں کہ جو ہم سے گستاخی کرتا ہے، وہ قتل کر دیا جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں جاہلیت میں یہی ہوتا تھا مگر اسلام نے پست اور بلند کو ایک کر دیا، جبلہ نے کہا اگر یہ ایسا ہی مذہب ہے جو شریف و رذیل میں فرق نہیں کرتا تو میں اس سے باز آیا اور چھپ کر قسطنطنیہ بھاگ گیا لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

اسلام اس لحاظ سے بھی دینِ رحمت ہے کہ اس میں دین و دنیا کی جامعیت ہے، اس نے دونوں میں اعتدال قائم کیا ہے۔ اس کے نزدیک دین و دنیا اور جسم و روح ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ خدا کی ہدایت ار و مرضی کے مطابق زندگی گزارنے اور دنیاوی حقوق ادا کرنے سے دین کی تکمیل ہوتی ہے، ہر مسلمان دعا کرتا ہے کہ خداوند ہم کو دنیا اور آخرت کی بھلائی عطا کر۔ [۱۸]

اسلام نے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے متمتع ہونے کی اجازت دی ہے اور آدمی کی روح کی طرح اس کے جسم کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے، نفس کشی، رہبانیت اور ترک دنیا کو حرام قرار دیا ہے، انسان پر کوئی ایسی عبادت فرض نہیں کی گئی ہے جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ [۱۹] شریعت کے احکام وقوانین میں آسانی اور سہولت کا خیال رکھا گیا ہے۔ [۲۰] دین میں کوئی تنگی اور دشواری نہیں ہے۔ [۲۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دین کو سہل اور آسان بتایا ہے، آپ جب لوگوں کو اسلام کی دعوت و اشاعت کے لیے بھیجتے تو تاکید فرماتے کہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، دشواری نہ پیدا کرو۔ انھیں مانوس بناؤ اور متنفر نہ کرو۔ [۲۲] آپ نے عبادت میں غلو اور دین داری میں شدت سے روکا ہے،

روحانی تزکیہ اور اصلاح کے لیے سخت قسم کے مجاہدات، جسمانی مشقوں اور نفس کو ضرر اور ایذا پہنچانے سے منع کیا ہے، کیوں کہ اسلام دین رحمت اور انسانی فطرت کے مطابق ہے، اس میں سختی کے بجائے آسانی اور نرمی ہے، رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ ''دین آسان ہے، جو اس کے معاملے میں شدت اختیار کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔''[۲۳]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے متعلق آپ کو معلوم ہوا کہ وہ رات بھر نماز پڑھتے اور دن کو مسلسل روزے رکھتے ہیں تو آپ نے انھیں اس سے منع کیا اور فرمایا کہ تم روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور رات میں سوؤ بھی۔ تم پر تمہاری آنکھ، تمہارے جسم، تمہارے نفس اور تمہارے اہل وعیال کا بھی حق ہے، حضرت عبداللہ نے کہا میں اس سے زیادہ مشقت برداشت کر سکتا ہوں، ارشاد ہوا تو تم صوم داؤدی رکھو حضرت داؤدؑ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے، یہ بہترین روزہ ہے۔[۲۴]

عبادت میں سہولت کے خیال سے آپؐ نماز جماعت میں طویل قرأت کو پسند نہیں کرتے تھے اور ہلکی نماز پڑھانے کا حکم دیتے کیوں کہ جماعت میں کمزور اور بوڑھے لوگ بھی ہوتے ہیں، ہاں تنہا نماز پڑھنے والا جتنی چاہے لمبی نماز پڑھے۔[۲۵]

ایک مرتبہ آپ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جس میں چلنے کی طاقت نہیں تھی اور اپنے بیٹوں کے سہارے پیدل چل رہا تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے پا پیادہ حج کرنے کی منت مانی ہے، آپ نے فرمایا کہ اس شخص کے اپنے آپ کو اذیت دینے سے اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور اسے سواری پر جانے حکم دیا۔[۲۶]

آپ نے دین کے معاملے میں سہولت کے خیال سے مسافر کو نماز قصر کرنے، روزہ افطار کرنے اور مریض کو روزہ قضا کرنے کی اجازت دی، سخت ٹھنڈک اور بارش میں گھروں پر نماز پڑھ لینے اور جمات چھوڑ دینے کی اجازت دی ہے۔[۲۷]

ایک دفعہ آپ نے صحابہ کرام میں تین طرح کے لوگوں کے غلو فی الدین کا حال سن کر فرمایا: ''خدا کی قسم میں تم سب لوگوں سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں مگر اس کے باوجود روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، جو شخص

میری سنت سے اعراض کرے وہ میری جماعت سے نہیں۔"[۲۸]

اسلام اعتدال پسند اور دین رحمت ہے، اس نے نکاح کی ترغیب دلائی ہے اور تجرد کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ زُہد وتقشّف کی وجہ سے قوت رجولیت ہی ختم کرنے سے آپ نے منع کیا ہے۔ زاہد وعابد اشخاص کمال دین داری کی بنا پر دنیاوی لذتوں کو چھوڑ دیتے اور جائز نعمتوں اور آسائشوں کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور متعدد آیتوں میں خدا کی دی ہوئی آسائش سے فائدہ اٹھانے کی ہدایت کی مثلاً ایک جگہ ہے: "اے ایمان والو! ان چیزوں کو حرام نہ کرو جن کو اللہ نے حلال کیا ہے اور حد سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اللہ نے تم کو جو حلال اور پاکیزہ رزق دیا ہے، اس کو کھاؤ اور اس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔"[۲۹]

عبادت گاہوں میں خاص طور سے زیب وزینت اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔[۳۰]

اسلام میں آرام اور آسائش کی زندگی گزارنے کے لیے کسب معیشت کی تاکید کی گئی ہے اور دن میں اس کے لیے تگ ودو کرنے پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے، احادیث نبوی میں بھی کسب معاش کے لیے سعی وکوشش اور دوڑ دھوپ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اسلام دراصل دو چیزوں سے عبارت ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد، اسی کو قرآن مجید نے ایمان وعمل صالح کا نام دیا ہے یعنی آدمی کا ایمان اللہ پر ہو اور وہ اس کے حقوق ادا کرے، عمل صالح کا زیادہ تعلق خدا کی مخلوق سے ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اور معاملہ کیا جائے، اسلام نے خالق ومالک اور دنیا کی تمام مخلوقات سے تعلق کی مختلف نوعیتیں بیان کر کے ان کو ادا کرنے کی تاکید اسی لیے کی ہے کہ ایک صاف ستھرا معاشرہ اور ایسا بہتر اور پرامن سماج وجود میں آئے جو ظلم وعدوان اور فتنہ وشر سے پاک ہو۔ ان حقوق کا ذکر آگے آئے گا جو اسلام کے دین رحمت ہونے کا ثبوت ہیں، اس سے پہلے ہم انسانی معاشرے کی فلاح وبہبود اور دنیا کے نظام کو درہم برہم ہونے سے بچانے کے لیے بعض اصولی احکام وتعلیمات کا ذکر کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیے ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے اہم چیز حق وعدل ہے۔ اسلام نے اس کا قیام ہر مسلمان کی ذمہ داری بتائی ہے کیوں کہ اسی پر کارخانہ عالم کا قیام اور بقا منحصر ہے۔ اگر عدل وانصاف نہ ہو تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نے اس کے لیے قوانین ہی نہیں بنائے جن سے لوگوں کو صرف مجبور کیا جاتا

ہے بلکہ اس کی رحمت نے اس کے لیے انسانی ضمیر کو بیدار کیا اور اسے شرافت نفس کا تقاضا بتایا، قرآن مجید کہتا ہے اللہ عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے، اس کے عدل ہی سے کارخانہ عالم قائم ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اس لیے ہوئی کہ لوگ عدل وقسط پر قائم رہیں (سورۂ حدید، آیت: ۲۵) قرآن مجید نازل کیے جانے کی غایت یہ بتائی کہ پیغمبرؐ اللہ کی دی ہوئی سوجھ بوجھ سے لوگوں کے درمیان حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کریں اور خیانت کرنے والوں اور دغابازوں کی بے جا طرف داری نہ کریں۔[۳۱]

متعدد آیتوں میں مقدمات اور شہادتوں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہنے کی ہدایت کی گئی ہے، یہاں تک کہ اپنا ذاتی یا والدین اور رشتہ داروں کا معاملہ بھی ہو تب بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔[۳۲] اس سے بڑھ کر رحمت اور کیا ہوگی کہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۳۳]

اسلام کی نگاہ میں مجرم کو اس کے جرم کی سزا دینا ظلم ونا انصافی نہیں رحمت ہے، عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مجرموں کے معاملے میں کوئی اور رعایت نہ کی جائے ورنہ معاشرے اور حکومت کا نظام قائم نہیں رہے گا۔ بعض لوگ غربت کے اندیشے سے اس پر ترس کھا کر اس کی بے جا حمایت اور طرف داری کرنے لگتے ہیں، قرآن نے اس سے بھی باز رکھا ہے اور کہا ہے اللہ سے بڑھ کر کون کسی کا خیر خواہ ہوگا۔[۳۴] زنا کار مرد وعورت کو جہاں کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی دین کے معاملے میں رحم وشفقت کرنے سے باز رکھا گیا ہے۔[۳۵]

آنحضرتؐ بھی حدودِ الٰہی کے معاملے میں کوئی سفارش قبول نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ’’محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔‘‘[۳۶]

لیکن اگر کسی کے ذاتی معاملے میں کسی نے ظلم وزیادتی کی ہو تو جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اسے اختیار ہے کہ چاہے تو برابر کا بدلہ لے اور چاہے تو معاف کردے لیکن معاف کردینے اور ظلم پر صبر کرنے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کو زیادہ بہتر کہا گیا ہے۔[۳۷]

رسول اکرمؐ کا معمول یہ تھا کہ آپ اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیتے تھے اور برائی کا جواب بھلائی سے دیتے تھے۔[۳۸] ایک یہودی عورت نے آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، کھانے کے درمیان ہی آپ کو اس کا اندازہ ہوگیا اور جب عورت سے پوچھا تو اس نے اقرار بھی کرلیا مگر آپ نے

اس کو سزا دینے کے بجائے معاف کر دیا۔[۳۹]

عدل وانصاف جس طرح ضروری ہے اسی طرح احسان اور اچھا سلوک اور رحمت وشفقت بھی ضروری ہے، ہر ایک کے الگ الگ مواقع ہیں، اسلام چونکہ دینِ رحمت اور ایک جامع مذہب ہے اس لیے اعتدال کا راستہ اپنایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ احساس اور رحم کرنے والوں کو پسند کرتا اور عدل واحسان اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔[۴۰] قارون کو اللہ نے بڑی دولت سے نوازا تھا اسے حکم دیا کہ جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی اسی طرح لوگوں کے ساتھ احسان کرو۔[۴۱]

احادیث میں رحم وشفقت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ فرمایا: ''رحم کرنے والوں پر خدائے رحمان رحم کرتا ہے، زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''[۴۲] ''جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔''[۴۳]

اسلام کی شان رحمت اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ لوگوں سے رفق، نرمی، ملاطفت، ہم دردی اور حسن اخلاق سے پیش آنے کی تاکید کرتا ہے اور سب سے اچھی اور نرم بات چیت کرنے کی تلقین کرتا ہے۔[۴۴] حضرت موسیٰ وہارون کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہا گیا کہ اس سے نرمی سے بات کہنا۔[۴۵] خدا نے اپنی صفت لطیف بتائی ہے اور رسول اللہؐ کی شان بھی نرمی اور رحم دلی تھی، متعدد حدیثوں میں آپؐ کی شان بتائی گئی ہے۔ رفق، لطف، مدارات، حلم وبردباری، نرم دلی اور نرم خوئی اور خوش خلقی وخندہ جبینی مروت تھی حافظ شیرازی نے خوب کہا ہے:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
باد وستاں تلطف بادشمناں مدارا

اسلام میں ظلم وزیادتی اور جبر وقہر کی کوئی گنجائش نہیں، اس سے انسانی معاشرہ تباہ ہوتا ہے، بستیاں اجڑ جاتی اور آبادیاں ویران ہوجاتی ہیں، جو حکومتیں ظلم کو اپنا شیوہ بنا لیتی ہیں اور عدل وانصاف کا دامن چھوڑ دیتی ہیں وہ لٹ جاتی ہیں کیوں کہ اللہ ظلم کو اور تعدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں عذاب الیم کی وعید سناتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں ہے: ''اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کر لیا ہے اور تم لوگوں کے درمیان بھی اس کو حرام کیا ہے، اس لیے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو... ظلم سے بچو، قیامت کے دن یہ تاریکیاں بن جائے گا۔''[۴۶] ایک اور حدیث میں ہے کہ مظلوم کی بددعا سے بچوں

کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔[۴۷]

دین رحمت اسلام کی ان اصولی ہدایات کے بعد اب ہم حقوق کے باب میں اس کے لطف ورحمت کے جلوے دکھائیں گے۔ اسلام نے نہ صرف انسانوں کے مختلف اقسام وطبقات قایم کر کے سب کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ بلکہ حیوانات ونباتات کے حقوق متعین کر کے ان پر اپنے رحم وکرم کی بارش کی ہے، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔[۴۸] قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں صلہ رحمی کی تاکید اور قطع رحم کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ''رحم رحمان سے نکلی ایک شاخ ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو تجھ کو کاٹے گا میں اس کو کاٹوں گا۔''[۴۹] ایک اعرابی نے آپ سے کہا مجھے ایسی چیز بتایئے جو مجھ کو جنت سے قریب اور آتش دوزخ سے دور کردے ارشاد ہوا اللہ کی عبادت کرو، اس کا ساجھی کسی کو نہ بناؤ، نماز پڑھو، زکوۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔[۵۰] آپ نے ان لوگوں سے بھی صلہ رحمی کرنے کا حکم دیا ہے جو رحم کو کاٹتے ہیں۔[۵۱]

رشتہ داروں میں سب سے قریب ترین اور اہم والدین ہیں، وہ خدا کے بعد انسان کے سب سے بڑے محسن ہیں، اسی لیے قرآن مجید میں خدا کی عبادت کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر آیا ہے، اس لیے مخلوق میں آدمی کے حسن سلوک کے سب سے زیادہ مستحق وہی ہیں۔ قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو ان سے اف نہ کیا جائے اور نہ انھیں جھڑکا جائے اور ان سے شریفانہ بات کی جائے اور ان سے بڑے جھکے اور رحم دلانہ انداز میں پیش آیا جائے اور اللہ سے دعا کرو کہ اللہ ان پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھ پر بچپن میں رحم کیا ہے۔[۵۲] مشرک والدین کے ساتھ بھی بہتر سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اگر وہ شرک کے لیے مجبور کریں تو ان کی بات نہ مانو، تاہم دنیا کے اور معاملات میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔[۵۳]

عبداللہ بن عمرو بن عاص نے رسول اللہؐ سے پوچھا خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ کام کون ہے؟ فرمایا: وقت سے نماز پڑھنا، پوچھا پھر فرمایا: والدین کے ساتھ نیکی کرنا پوچھا پھر کیا ہے فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔[۵۴]

جہاد کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے لیکن بوڑھے ماں باپ کی خدمت کو اس پر بھی ترجیح حاصل ہے۔ ایک صاحب نے رسول اللہؐ سے جہاد میں جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے ان سے پوچھا کیا

تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں۔ فرمایا جاؤ ان کی خدمت کرو تمہارا یہی جہاد ہے۔[۵۵]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا وہ ذلیل وخوار ہے، وہ ذلیل وخوار ہے، دریافت کیا گیا کہ کون یا رسول اللہ فرمایا جس نے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا (اوران کی خدمت کرکے) جنت نہ حاصل کرسکا۔[۵۶]

والدین میں بھی ماں کا حق دین رحمت نے زیادہ بتایا ہے اس نے تکلیفیں جھیل کر پیٹ میں بچے کو ڈھویا اور جنا ہے اور دودھ پلایا ہے۔ حمل و رضاعت کا عرصہ ۳۰ مہینے ہے۔[۵۷]

ایک شخص نے تین بار آپؐ سے سوال کیا کہ میرے حسن وسلوک کا مستحق سب سے زیادہ کون ہے؟ ہر بار آپ نے جواب دیا کہ تمہاری ماں اور چوتھی بار جب دریافت کیا تو فرمایا تمہارا باپ۔[۵۸]

بعض حدیثوں میں ہے کہ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔''

ماں باپ کی وفات کے بعد بھی ان کا حق ختم نہیں ہوتا، اولاد کو ان کے لیے برابر دعائے مغفرت کرنی چاہیے، ان کا قرض ادا کرنا چاہیے، ان کے وعدے اور وصیت کی تکمیل کرنی چاہیے، ان کے دوستوں اور ملاقاتیوں کا اعزاز واکرام کرنا چاہیے۔ جس طرح اولاد پر ماں باپ کے حقوق ہیں اسی طرح اولاد کے حقوق والدین پر بھی ہوتے ہیں، بچہ جب رحم مادر میں ہو اسی وقت سے اس کے تحفظ کا خیال کرنے کا حکم اور حمل کے استقاط سے منع کیا گیا ہے اور پیدائش کے بعد بچوں کی پرورش و پرداخت میں کسی طرح کی کوتاہی کرنے سے روکا گیا ہے اور فقر وفاقہ کے اندیشے سے اولاد کشی کو بڑا گناہ بتایا گیا ہے کہ روزی رساں تو خدا ہے۔[۵۹] ایک اور آیت میں ہے کہ جو لوگ جہالت اور بے علمی سے اولاد کو قتل کردیتے ہیں وہ بڑے گھاٹے میں ہیں۔[۶۰] ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ سے ایک صاحب نے پوچھا کہ سب سے بڑا گناہ کون ہے، فرمایا کہ تم خدا کا کسی کو شریک ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا ہے، انھوں نے پوچھا پھر، ارشاد ہوا اولاد کو اس خوف سے قتل کرو کہ وہ تمہارے ساتھ شریک طعام ہوگی۔ اہلِ عرب لڑکیوں کو باعثِ عار سمجھتے تھے، قرآن مجید نے کہا: ''جب زندہ درگور کی گئی لڑکیوں کے بارے میں پوچھا جائے گا''،[۶۱] لوگ رسول اللہؐ کے سامنے زمانہ جاہلیت میں قتل کی جانے والی لڑکیوں کے واقعات بیان کرتے تو آپ تڑپ جاتے اور رونے لگتے، اسی لیے آپ نے ان کے قتل کی شدید مذمت کی اور ان کی پرورش و پرداخت کے متعلق ایسی ہدایات دیں کہ لوگ لڑکیوں کی پیدائش اور پرورش کو نہایت مستحسن

خیال کرنے لگے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں پھر آپ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر کہا تو قیامت کے روز میرا اور ان کا ساتھ ان ہی کے مانند ہوگا۔[۶۲] دوسری حدیث میں ہے کہ جس شخص نے تین لڑکیوں کی پرورش اور شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔[۶۳]

اولاد چاہے لڑکا ہو یا لڑکی سب کو یکساں سمجھنا چاہیے، لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینا روا نہیں ہے، جس طرح لڑکوں کی پرورش، تعلیم و تربیت ضروری ہے، اسی طرح لڑکیوں کی بھی ضروری ہے، رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع خیرات کرنے سے بہتر ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ والد کا سب سے بہتر عطیہ اولاد کے لیے حسن ادب کی تعلیم ہے۔[۶۴]

رسول اللہؐ نے اولاد اور دوسرے ورثہ کا حق ادا کرنے کی غرض سے والدین کو ایک ثلث سے زیادہ وصیت کرنے کی ممانعت کی ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنے بعد ورثہ کو خوش حال چھوڑنا محتاج چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔[۶۵] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بچوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور اپنی اولاد حضرت فاطمہ اور ان کے بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ''جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

زوجین کے باہمی حقوق کی تعیین کر کے اسلام نے عورتوں کو پستی سے نکال کر بہت بلند درجے پر پہنچا دیا۔ ان کو میراث بنانے کے بجائے ان کو وراثت میں حصہ دار بنایا، مردوں کے برابر حقوق دیا، ان کو ن اللہ کی نشانی قرار دیا، ان کے ساتھ حسن سلوک، حسن معاشرت اور نرمی و ملاطفت کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا، ان کی دل جوئی اور عزت نفس کا خیال رکھنے کی تاکید کی، اسلام میں تجرد، رہبانیت اور عورتوں سے بے تعلقی اخلاق و روحانیت کا کمال نہیں اور نہ ازدواجی زندگی روحانیت اور مذہبی تقدس کے منافی ہے، بلکہ یہ عفت اور پاک دامنی کا وسیلہ اور انسانی زندگی کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی لیے اسلام نے ہر مسلمان کو شادی کا حکم دیا ہے بلکہ خاص حالتوں میں چند شرطوں کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔[۶۶] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے، بیوہ عورتوں اور لونڈی غلاموں کی شادی کرنے کا حکم دیا ہے۔[۶۷] بیوی کو سکون وانس اور الفت و محبت کا ذریعہ اور ایک دوسرے کا لباس

بتایا۔[۶۸] معاشرتی زندگی میں دونوں کے حقوق برابر ہیں۔[۶۹] مرد کو خاندان کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے جو یک گونہ فضیلت ہے، اس سے حقوق کی برابری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ''مرد عورتوں کا نگراں ہے، اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورتوں پر جسمانی اور عقلی حیثیت سے برتری دی ہے اور اس سبب سے بھی کہ مرد بیویوں پر اپنا مال مرچ کرتے ہیں۔''[۷۰] اگر میاں بیوی میں کسی وجہ سے ناگواری اور نااتفاقی ہو جائے تب بھی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک سے گزر بسر کرو، اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو بہت ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت خیر و برکت دے۔''[۷۱]

معمولی گھریلو باتوں کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں کبھی کبھی کشیدگی ہو جاتی ہے جو اکثر عورتوں کی نازک مزاجی اور فطری جبلت کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لیے مردوں کو انھیں نظرانداز کر دینے اور ضبط و تحمل سے کام لینے کا حکم دیا ہے، رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ

> ''عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اگر انھیں سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو انھیں توڑ دوگے، ان کی کجی کے باوجود ان سے نباہ کرو۔''[۷۲]

کشیدگی بڑھنے پر دونوں میں صلح کرانے کی پوری کوشش کی جائے، ایک ایک صلح کار دونوں کے خاندان سے مقرر کیے جائیں، اگر یہ دل سے صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں میں صلح کرا دے گا۔[۷۳] اگر عورت کو شوہر کی طرف سے زیادتی اور بے رغبتی کا خوف ہو تو دونوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ آپس میں صلح کرلیں، یہی بہتر ہے۔[۷۴] لیکن اگر صلح کی صورت نہ بنے اور گھریلو زندگی کا پورا نظام درہم برہم ہو رہا ہو، الفت و محبت کی جگہ اختلاف و شقاق لے لے اور علاحدگی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہ جائے تو طلاق دے سکتا ہے جو جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز ہے۔ لیکن وہ بھی خوش اسلوبی سے دے، بہ یک وقت تین طلاقیں نہ دیا کرو وقفے وقفے سے دے کیوں کہ ممکن ہے، اس درمیان میں صلح کی کوئی شکل نکل آئے۔

اسلام نے مردوں کو اگر طلاق کا حق عطا کیا ہے تو اسی طرح عورتوں کو خلع کا اختیار دیا ہے کہ کچھ دے دلا کر وہ مردوں سے گلوخلاصی حاصل کر سکتی ہیں۔

عورتوں کو جو حقوق دیے گئے ہیں ان میں مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا عقدِ ثانی بھی ہے، شوہر پر مہر

کی ادائیگی اور عدت کے ایام عدت کی کفالت ضروری ہے، ان مسائل اور ان کی وراثت کے احکام کا مفصل ذکر قرآن وحدیث میں موجود ہے۔

اسلام کی رحمت پر مبنی تعلیمات میں عورت کی قدر و منزلت میں کسی طرح کی کمی نہیں ہے، نبیؐ کو تین چیزیں مرغوب تھیں، عورتیں، خوشبو اور آپ کی آنکھ کی ٹھنڈک نماز تھی۔ لوگوں کو اپنے آخری خطبہ میں عورتوں پر ظلم وزیادتی سے روکتے ہوئے فرمایا: ''عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔''[۵۵]

ایک مرتبہ آپ ازواج مطہرات کے ساتھ سفر کر رہے تھے تو ساربان انجشہ نے اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے حدی خوانی شروع کی تو آپ نے فرمایا انجشہ! شیشوں کو سنبھال کر لے چلو۔[۵۶]

عفت اور پاکدامنی کو عورتوں کی عزت وآبرو کے تحفظ کا سامان کیا، ان پر جھوٹی تہمت لگانے کو ملعون قرار دیا... اور تہمت لگانے والے اگر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انھیں اسّی کوڑے لگانے کی سزا دی۔[۵۷] نکاح میں عورتوں کی پسند اور رضامندی کو ضروری قرار دیا اور جو شادی جبراً کر دی جائے اس میں ان کو فسخ نکاح کا حق دیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہ کی ایک لونڈی تھیں اور وہ مغیث نام کے ایک غلام کے نکاح میں تھیں۔ حضرت عائشہ نے ان کو آزاد کر دیا، اس کی وجہ سے اسلامی قانون کے مطابق انھیں خیار عتق حاصل ہو گیا، اس کی رو سے اب وہ چاہیں تو اپنے شوہر کے ساتھ رہیں یا ان سے علاحدگی اختیار کر لیں۔ بریرہ نے علاحدگی اختیار کر لی اور مغیث کو چھوڑ دیا وہ ان کے لیے روتے پھرتے تھے، ان کی وارفتگی کی خبر رسول اللہ کو ہوئی تو آپؐ نے بریرہ کو بہت سمجھایا کہ تم مغیث کے پاس لوٹ جاؤ، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا یہ آپؐ کا حکم ہے؟ آپؐ نے کہا نہیں صرف مشورہ اور سفارش ہے، بریرہ نے کہا تو پھر میں واپس نہیں جاتی۔[۵۸]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی رحمت نے عورتوں کو کس قدر آزادی اور حق بخشا ہے۔

یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دے کر اسلام نے ان طبقوں پر بھی رحم وکرم کیا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے وہاں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی احسان کرنے کا ذکر ہے۔[۵۹]

اسلام نے یتیموں کے مال کے تحفظ اور نگرانی کا حکم دیا اور سرپرستوں کو اس میں ناجائز تصرف سے باز رکھا، ان کا مال ہڑپ لینے اور اسے کھا جانے والوں کو جہنم کی وعید سنائی، ناسمجھ یتیموں کا

مال بغیر عقل وشعور کو پہنچے ان کے حوالے کرنے پر بندش لگائی، احادیث میں بھی ان کی امداد اور دست گیری کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اسی طرح فقرا ومساکین، مقروض ومسافر تمام کمزور اور حاجت مند لولوں کی ضرورتیں پوری کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ آپ کسی سائل کو نہ جھڑکتے تھے اور نہ واپس کرتے تھے۔

غلاموں پر بھی دوسرے مظلوم طبقات کی طرح اسلام نے اپنی رحمت ورافت کا سایہ ڈالا، آپؐ کے زمانہ بعثت میں ساری دنیا میں لونڈی غلام بنانے کا رواج تھا اور یہ اس زمانے کی ناگزیر ضرورت تھی جس کو مٹانا ناممکن تھا، لیکن اسلام نے اس میں بڑی اصلاحات کیں، غلاموں کو اتنے حقوق دیے اور آقاؤں پر اتنی ذمہ داریاں عاید کیں کہ غلامی کی نوعیت ہی بدل گئی، ان کو اونچا اٹھا کر غلام کو آقا کے خاندان کا ایک فرد بنا دیا۔ اس کی آزادی وترقی کی راہیں کھول دیں، علم وکمال کا ہر میدان اسلامی تاریخ میں غلاموں کے کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔

اسلام نے جنگ کے قیدیوں کے سوا کسی آزاد شخص کو زبردستی غلام بنانے سے روک دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں سے جھگڑا کرے گا، ان میں ایک وہ شخص ہوگا جو کسی آزاد مسلمان کو غلام بنا کر فروخت کر دے گا۔[۸۰] قرآن مجید میں ایک جگہ نیکی کے مختلف کاموں کا ذکر کرتے ہوئے غلاموں کو آزاد کرنے کو بھی نیکی کا کام بتایا۔[۸۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام آزاد کرنے پر بڑا زور دیا ہے، اس کے اثر سے غلاموں کو آزاد کرنا صحابہ کرام کا معمول ہو گیا تھا، ابتدائے اسلام میں غلاموں کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کی وجہ سے ان کے آقا انھیں سخت اور ناقابلِ برداشت سزائیں دیتے تھے، حضرت ابوبکرؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے ان مظلوموں میں بہت سے لوگوں کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

قتل خطا اور گناہوں کے کفارے میں قرآن نے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا جیسے ظہار، فرض روزے اور قسمیں توڑنے کے کفارے میں لوگ غلام آزاد کرتے تھے، اگر کوئی غلام آزاد ہونا چاہے تو اسلام نے اس کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے آقا کو ایک مقررہ رقم دے کر جو دونوں میں طے ہو جائے آزادی حاصل کر سکتا ہے، اسی کو شرعی اصطلاح میں مکاتبت کہا جاتا ہے۔

احادیث میں غلاموں اور لونڈیوں کو بھائی بہن کا درجہ دے کر حکم دیا گیا ہے کہ جو خود کھاؤ اور

پہنو وہی ان کو بھی کھلاؤ اور پہناؤ۔[۸۲] بعض حدیثوں میں ہے کہ مالک کو غلام کو اپنے ساتھ بیٹھا کر کھانا کھلانا چاہیے[۸۳] آپ نے غلام اور لونڈی کہنے کے بجائے انھیں بیٹا اور بیٹی کہنے کی تاکید کی، انھیں مارنے اور سزا دینے سے منع کیا، آپؐ نے فرمایا کہ جو اپنے غلام کو مارے اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کردے، صحابہ کرام ایسا ہی کرتے تھے، آپؐ نے غلاموں کو غلطیاں معاف کرنے کی ہدایت کی۔ ارشاد ہے کہ جس کے پاس لونڈی ہوں اور اس نے اس کی پرورش کی اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھا پھر اسے آزاد کرکے اس کی شادی کردی تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔[۸۴] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام زید بن حارثہ اور ان کے بیٹے اسامہ کو بعض جنگوں میں لشکر کا امیر بنایا، زید سے اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی کی، مالِ غنیمت میں آپ غلاموں کا حصہ لگاتے تھے، جو لوگ غلام نہ تھے لیکن انھوں نے آپ کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کردیا تھا، ان پر بھی آپ کے دریائے رحم وکرم کا فیض جاری رہتا تھا، حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ میں دس برس تک آپؐ کی خدمت میں رہا لیکن آپ نے کبھی کسی پر غصہ نہیں کیا اور نہ مجھ سے ناراض ہوئے، کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ فلاں کام کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا۔[۸۵]

اسلام کی شفقت ونوازش کے مستحقین میں پڑوسیوں کا درجہ بھی اہم ہے، قرآن مجید نے ان کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا ہے اور ان کی حسب ذیل تین قسمیں بتائی ہیں: (۱) قرابت والے پڑوسی۔ (۲) اجنبی پڑوسی۔ (۳) پاس بیٹھنے والے، ان سب کے بارے میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا: ''وہ مومن نہیں، لوگوں نے دریافت کیا کون اے رسول اللہ۔ ارشاد ہوا جس کے پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ رہیں۔[۸۶] یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''وہ مومن نہیں جو خود کو شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔[۸۷] ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت جبریل پڑوسیوں کے متعلق مجھے اتنی کثرت سے وصیت کرتے رہے کہ مجھے خیال ہوا کہ وہ انھیں وراثت میں حصہ دار بنا دیں گے۔[۸۸]

ایک دفعہ آپ سے ایک عورت کا ذکر کیا گیا جو رات بھر عبادت اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتی تھی اور صدقہ کرتی تھی لیکن اپنی بدزبانی سے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی تھی تو آپ نے فرمایا وہ دوزخی ہے، پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ فلاں عورت صرف نماز پڑھتی، رمضان کے روزے رکھتی اور کپڑے خیرات کرتی ہے لیکن کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی تو آپ نے کہا کہ وہ جنتی ہے۔[۸۸] ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے

نزدیک ساتھیوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپس میں بغض وکینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو، غیبت نہ کرو اور خدا کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ، ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق جائز نہیں، اسی طرح بدگمانی اور دوسرے کی ٹوہ سے منع کیا گیا۔[۸۹] وہ شخص مسلمان نہیں جو اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔[۸۹]

مسلمانوں کے ساتھ اخلاص اور ان کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔[۹۱] سلام سے محبت وخلوص میں اضافہ ہوتا ہے۔[۹۲] اور مصافحہ سے مغفرت ہوتی ہے۔[۹۳]

رسول اللہؐ نے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کے یہ حق بتائے ہیں: سلام کرنا، سلام کا جواب دینا، چھینک آنے پر اس کے لیے رحمت کی دعا کرنا۔ اس کی دعوت قبول کرنا، اس کی عیادت کرنا، اس کے جنازے میں شرکت کرنا، جب کوئی مسلمان کوئی مشورہ طلب کرے تو نیک مشورہ دینا۔[۹۴] اسی طرح کے اور حقوق بھی بتائے ہیں، بہ ظاہر تو یہ بہت چھوٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ان پر عمل کیا جائے تو ان کا رحمت ہونا اور کسی معاشرے کے اصلاح وفلاح کے لیے ان کا ضروری ہونا واضح ہوجائے گا۔

اسلام کی رحمت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں صرف مسلمان اور رشتہ دار ہی شامل نہیں ہے بلکہ وہ ہمہ گیر ہے اور دنیا کے سارے انسان اور ہر قوم وملک اور ہر طبقہ وگروہ کے لوگ اس میں شامل ہیں، اس لیے اس نے غلام انسانوں کے حقوق بھی بتائے ہیں جن کو ادا کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا ہے، اس نے فرقہ ومذہب اور ملک وقوم کی بنا پر تفریق وامتیاز کو تعصب اور تنگ نظری بتا کر اس کی شدید مذمت کی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور سب سے بہتر مخلوق وہ ہے جو اللہ کے کنبے کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرے۔[۹۵]

اسلام کے نزدیک سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور انسانیت کے رشتے سے سب بھائی بھائی ہیں اس لیے آپ نے ہدایت فرمائی کہ ایک دوسرے سے تعلقات ختم نہ کرو، نہ ان سے منہ پھیرو، نہ کسی سے حسد اور کینہ رکھو۔[۹۶] آپ کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ لوگوں کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔[۹۷]

اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت پہلے واضح کی جا چکی ہے۔قرآن مجید میں سب کے ساتھ بلاتفریق مذہب وملت عدل واحسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسلام نے غریبوں کی دست گیری مظلوموں کی امداد اور کمزوروں کی اعانت کا جو حکم دیا ہے اس میں مسلمان کے ساتھ غیر مسلم بھی شامل ہیں، انسان ہونے کی حیثیت سے مسلم اور غیر مسلم سب ہی خدا کے بندے ہیں۔ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ قیامت کے دن فرمائے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوا لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا میں تیری عیادت کیسے کرتا تو تو ساری دنیا کا خداوند ہے، اللہ تعالیٰ کہے گا: ''میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا۔'' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کھانا مانگنے اور پانی طلب کرنے کا ذکر کیا جن کے متعلق یہی سوال وجواب ہوا۔[۹۸]

یہ حدیث تمثیل ہے جس میں ہر حاجت مند انسان کی امداد ودست گیری کو مسلمان کا فریضہ بتایا گیا ہے چاہے وہ کسی مذہب وقوم کا ہو۔

اسلام نے غیر مسلموں سے رحم دلی، وسیع النظری، کشادہ دلی اور رواداری سے پیش آنے کا حکم اسی لیے مسلمانوں کو دیا ہے کہ وہ بھی اللہ کے بندے ہیں، قرآن مجید کہتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم رحمتِ الٰہی سے محروم نہیں ہے، ہر قوم میں پیغمبر آئے اور مسلمانوں کو تمام نبیوں پر اسی طرح ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، جس طرح حضرت محمدؐ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔مسلمانوں کے نزدیک اسلام ہی سچا مذہب ہے تاہم وہ ہر مذہب کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرنے کی تاکید کرتا ہے، کسی مذہب کو یا اس کے بزرگوں اور معبودوں کو برا بھلا کہنے سے مسلمانوں کو روکتا ہے، دین کے معاملے میں جبر واکراہ کو ناجائز بتاتا ہے، اپنے مذہب کی دعوت حکمت، اچھی باتوں اور نرمی سے دینے کی تلقین کرتا ہے، اگر کسی سے بحث بھی کی جائے تو اچھے اور بہتر انداز سے کی جائے۔جبر وقوت سے زبان سے اقرار تو کرایا جا سکتا ہے لیکن دل میں یقین نہیں پیدا کیا جا سکتا۔

ابتدا میں مسلمانوں کا سابقہ عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ سے زیادہ تھا، ان تینوں کی اسلام دشمنی سے کون واقف نہیں ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک کے ساتھ رواداری فیاضی کا معاملہ کیا۔

مشرکین برسہا برس تک آپؐ سے برسر جنگ رہے گو آپؐ بھی ان کا مقابلہ کرتے رہے لیکن

قرآن مجید میں حکم دیا گیا کہ ’’اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تم بھی جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو وہ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر ان کا ارادہ دھوکا دینے کا ہو تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔‘‘[۹۹] دوسری سورہ میں ہے کہ ’’اگر کوئی مشرک تم سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو پرامن جگہ پہنچا دو، اس لیے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔‘‘[۱۰۰] قرآن نے جنگی دشمنوں سے بھی بدعہدی سے روکا ہے، فرمایا: ’’جن مشرکین سے تم نے عہد و پیمان کیا پھر انھوں نے اس عہد کی پابندی میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان کے ساتھ معاہدے کی جو مدت مقرر ہے اس کو پورا کرو، جو لوگ بدعہدی سے بچتے ہیں ان کو اللہ دوست رکھتا ہے۔‘‘[۱۰۱]

حدیث میں ہے کہ ’’اگر کوئی کسی معاہد کو قتل کرے تو وہ جنت کی بو تک نہیں سونگھے گا۔‘‘ (صحیح بخاری) حضرت عمرؓ اپنے فوجی افسروں کو معاہدے کی پابندی کرنے کی تاکید خاص طور پر کرتے تھے، جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن وقاص کو جو فرمان بھیجا اس میں عہد کی پابندی کا حکم دیا اور بدعہدی سے روکا۔[۱۰۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین جنگ میں بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور عبادت کرنے والوں کو قتل کرنے، پھل دار درختوں کو کاٹنے، ہرے بھرے باغوں کو جلانے، جانوروں کو بیکار ذبح کرنے اور آبادیوں کو ویران کرنے سے منع کرتے تھے۔ فوجی ٹھکانوں اور دشمنوں کے گھروں کو لوٹنے سے بھی روکتے تھے، ایک غزوہ میں مسلمانوں کو کھانے کی سخت تکلیف ہوئی، ایک جگہ بکریوں کا گلہ نظر آیا تو اس کو لوٹ لیا اور ذبح کرکے گوشت پکانے کے لیے ہانڈیاں چڑھا دیں، رسول اللہؐ کو معلوم ہوا تو اپنے ہاتھ سے ساری ہانڈیاں الٹ دیں اور فرمایا لوٹ کا مال مردار کے برابر ہے۔[۱۰۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک فرماتے اور ان کو تکلیف پہنچانے سے باز رہتے، صفوان بن امیہ اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے، جنگ بدر میں ان کے والد مارے گئے تو انھوں نے ایک دوسرے دشمن اسلام عمیر بن وہب کو انعام کا لالچ اور ان کے اہل وعیال کی خبر گیری کا وعدہ کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر آمادہ کیا، وہ اس ارادے سے مدینے پہنچے، راز فاش ہو گیا، دھر لیے گئے مگر آپ نے انھیں معاف کر دیا۔ وہ مسلمان ہو گئے۔[۱۰۴]

صفوان کی دشمنی کم نہیں ہوئی، فتح مکہ کے بعد خوف سے وہ بھاگ گئے، عمیر نے اس کا ذکر

آپ سے کیا تو آپ نے فرمایا ان کو امان ہے اور نشان کے طور پر لوائے مبارک مرحمت فرمائی، وہ آنحضرتؐ کے پاس آئے اور عرض کی، مجھے دو مہینے کی مہلت دیجیے ارشاد ہوا تم کو چار مہینے کی مہلت ہے، اس کے بعد بھی وہ اپنے مذہب پر قائم رہے اور غزوہ طائف کے بعد مسلمان ہوئے۔[۱۰۵]

ہبار بن اسود بھی دشمن اسلام تھے، رسول اللہؐ کی صاحب زادری زینب ہجرت کر کے مدینہ آرہی تھیں تو راستے میں کفار نے مزاحمت کی، ہبار نے آپؐ کی دشمنی میں ان کو اونٹ سے گرادیا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا اور کچھ دنوں بیمار رہ کر وفات پا گئیں۔ اس لحاظ سے وہ ان کا قاتل اور اشتہاری مجرم تھا، وہ ایران بھاگنا چاہتا تھا مگر آپ کے احسانات اور عفو و کرم کو یاد کر کے آپ کے پاس آئے اور اپنے جرم و قصور کا اعتراف کر کے مسلمان ہونا چاہا، آپ نے معاف کر دیا۔[۱۰۶]

مسیلمہ کذاب کا قبیلہ بنی حنیفہ اسلام کا باغی تھا، ثمامہ بن آثال اس کے رؤسا میں تھے، اتفاقاً وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے اور رسول اللہ کے پاس لائے گئے، آپ نے مسجد نبوی کے ستون میں اس کو باندھنے کا حکم دیا، جب آپ مسجد تشریف لائے تو ثمامہ سے پوچھا اب کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا محمد! اگر تم مجھ کو قتل کر دو گے تو ایک خونی کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا، اور اگر فدیہ چاہتے تو جو مانگو گے دوں گا۔ آنحضرتؐ خاموش رہے، دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی سوال وجواب ہوا، تیسرے دن آپ نے ان کو آزاد کر دیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ غسل کر کے واپس آئے اور مسلمان ہو گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! پہلے میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض کوئی شخص نہ تھا اور اب دنیا میں آپ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں، پہلے آپ کے مذہب سے زیادہ میری نظر میں کوئی ناپسندیدہ مذہب نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ پھر وہ مکہ عمرہ کے لیے گئے۔ یہاں کے لوگوں نے ان کے قبول اسلام پر طنز کیا، ان کو بہت ناگوار ہوا، مکہ میں یمامہ سے غلہ آتا تھا، انھوں نے کہا اب آنحضرتؐ کی اجازت کے بغیر ایک دانہ بھی نہیں آئے گا۔[۱۰۷] ثمامہ عمرہ کر کے یمامہ پہنچے اور غلہ رکوادیا، اہل مکہ نے رسول اللہ سے فریاد کی، یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے آپ کو بنی ہاشم کے ساتھ شعب ابی طالب میں قید کر کے بھوکا پیاسا رکھا تھا، ایسے سنگ دلوں کی بھی آپؐ نے فریاد سنی اور ثمامہ سے کہلا کر غلہ کی بندش ختم کرادی۔[۱۰۸]

یہ غیر مسلموں کے حقوق اور برسرجنگ رہنے والے رسول اللہ کے خون کے پیاسوں کے

ساتھ ان کا رحم دلانہ اور روادارانہ سلوک تھا۔ اب ہم غیر مسلم رعایا کے ساتھ آ آپؐ کے لطف وکرم کی بارش کا ذکر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ذمی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی جان مال کے تحفظ کے لیے کچھ ٹیکس دیتے ہیں، اس کے عوض وہ مسلمانوں کی ذمہ داری میں ہوجاتے ہیں اور وہ ان کے حقوق اور جان ومال کے تحفظ کے ذمہ دار بن جاتے ہیں، اسلام ان کے لیے سراسر رحمت ہے، اور اس نے ان کو گوناگوں حقوق دیے ہیں، آنحضرتؐ نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ جو لطف وکرم کیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

ان کی جان محفوظ رہے گی، ان کی زمین جائیداد اور مال وغیرہ ان کے قبضے میں رہیں گے، ان کے کسی مذہبی معاملے میں کوئی داخل اندازی نہیں کی جائے گی، مذہبی عہدیداروں کو ان کے عہدوں پر باقی رکھا جائے گا، ان کی صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، ان کی کسی چیز پر قبضہ نہیں کیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی، پیداوار کا عشر نہ لیا جائے گا، ان کے ملک پر فوج کشی نہ کی جائے گی، مقدمات میں ان کے ساتھ انصاف کیا جائے گا، نہ ان کو ظلم کرنے دیا جائے گا اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کیا جائے گا اور ان میں جو لوگ سود کھائیں گے وہ میری ضمانت سے بری ہوں گے، کسی ناکردہ گناہ سے کسی مجرم کے بدلے میں مواخذہ نہ ہوگا، ظلم وجبر سے وہ کسی کام کے لیے مجبور نہیں کیے جائیں گے۔

خلفائے راشدین میں حضرت عمر کے زمانے میں بہت سے ملک فتح ہوئے، انھوں نے ذمیوں کے ساتھ جو عادلانہ اور رحم دلانہ سلوک کیا اس کی تفصیل بہت طویل ہے، سب سے اہم بیت المقدس کی فتح ہے، اس کے علاوہ جرجان اور آذربائیجان کے معاہدوں میں بھی ذمیوں کے مذہب وشریعت اور جان ومال کے حفظ وامان کی پوری ضمانت دی گئی ہے اور اس کا ذکر ہے کہ ان کو ان کے مذہب سے ہٹایا نہیں جائے گا اور نہ ان کے مذہبی امور میں کوئی مداخلت کی جائے گی۔ حضرت عمر اپنے فوجی افسروں اور صوبوں کے حکمرانوں کو برابر احکام بھیجتے تھے کہ ذمیوں کے حقوق کا تحفظ کریں اور ان سے کیے گئے وعدوں کو وفا کریں، ایک مرتبہ ان کو اطلاع ملی کہ اہواز کے ذمی اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، اس لیے انھوں نے بصرہ سے کچھ معتبر لوگوں کو بلا کر دریافت کیا کہ کیا ذمی مسلمانوں کے ظلم کی وجہ سے بھاگ رہے ہیں، ان لوگوں نے کہا وہ خود اپنی مرضی سے جا رہے ہیں، ان پر کوئی ظلم نہیں ہوا ہے،

حضرت عمر کو اس سے اطمینان نہیں ہوا اور انھوں نے والی بصرہ کو لکھا کہ لوگوں کو ذمیوں کے ساتھ ظلم وزیادتی سے روکو، ایسا نہ ہو کہ تمہاری بدعہدی اور ظلم کی وجہ سے حکومت تم سے چھین لی جائے، خدا نے تم کو عدل کے وعدے پر حکومت دی ہے، اس عہد کو پورا کرو اور اس کی مرضی پر چلو تاکہ خدا تمہاری مدد کرے۔[۱۰۹]

اسلام نے ذمیوں کی جان مسلمانوں کی جان کے برابر قرار دی ہے، رسول اللہؐ کے زمانے میں ایک مسلمان نے ایک ذمی اہل کتاب کو قتل کر دیا تو آپ نے اس مسلمان کو قصاص میں قتل کرا دیا۔[۱۱۰] حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہوا تو وہ سخت برہم ہوئے اور کہا کہ میں قصاص میں قاتل کو قتل کر دوں گا لیکن حضرت ابوعبیدہ نے ذمی مقتول کے ورثہ کو خون بہا کے لیے راضی کر لیا اور ایک ہزار سرخ دینار معاوضہ دلایا اور قاتل کو سخت تنبیہ کی۔ اس طرح کے اور بھی متعدد واقعات ہیں۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی ذمیوں کے قاتل کو یا تو قتل کیا گیا یا معاوضہ میں خون بہا دیا گیا۔ ذمیوں کے مال واسباب اور زمین وجائیداد کے معاملے میں بھی تحفظ کے متعدد واقعات موجود ہیں۔ ان کے مذہبی حقوق کے تحفظ اور مذہبی حقوق میں عدم مداخلت کے واقعات بھی بہ کثرت ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہلِ حیرہ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ ڈھائے جائیں گے اور نہ ان کو عید کے دن ناقوس بجانے اور صلیبیں نکالنے سے روکا جائے گا۔[۱۱۱] حضرت ابوعبیدہ نے شام کی فتح کے وقت عیسائیوں سے وعدہ کیا کہ روم کے گرجے، کنیسے اور خانقاہیں باقی رکھی جائیں گی۔[۱۱۲]

خلفائے راشدین کے بعد اموی وعباسی خلفا نے بھی معاہدوں کی پابندی کی اور کسی مذہب کی عبادت گاہ کو ہاتھ نہیں لگایا، خلفائے عباسیہ اور ان کے بعد کے حکمرانوں خصوصاً مغل بادشاہوں نے ذمیوں اور غیر مسلموں کو نظام حکومت میں بھی شریک کیا اور ان کی صلاحیت واستعداد کے مطابق انھیں مختلف معزز عہدوں پر فائز کیا۔

اسلام کا دامن رحمت اتنا وسیع ہے کہ وحوش وطیور بھی اس سے محروم نہیں ہیں، ان کے گوشت غذا کے طور پر استعمال کیے جانے کی روایت اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ہر مذہب میں جانور کے شکار اور ان کو ذبح کر کے کھانے کی اجازت ہے، دنیا کا ہر مذہب میں جانوروں کی قربانی کا حکم ہے، لیکن

اسلام نے اس میں حلال وحرام کی قید لگائی ہے اور حلال جانوروں میں بھی ان ہی کو جائز قرار دیا ہے جن کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو لیکن اسلام میں غذائی ضرورت کے علاوہ بلا وجہ کسی جانور کو مارنا یا ایذا پہنچانا گناہ قرار دیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین آدمیوں کو بڑا گناہ گار بتایا ہے: ایک جس نے عورت سے شادی کی اور اس سے لطف ہونے کے بعد طلاق دے دی اور مہر نہ ادا کیا، دوسرا جس نے کسی مزدور سے کام لیا اور اجرت نہ دی، تیسرے جس نے کسی جانور کو بے کار اور بلا ضرورت ہلاک کیا۔ [۱۱۳] آپؐ کا ارشاد ہے کہ جب تم کسی جانور کو مارو یا ذبح کرو تو اچھے طریقے سے مارو اور ذبح کرو، ذبح کرنے والا چھری تیز کر لے اور اپنے ذبیحے کو آرام پہنچائے۔ [۱۱۴]

رسول اللہؐ نے کسی جانور کو نشانہ بنانے اور مثلہ کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے، جانوروں کو بھوکا رکھنا اور انھیں تکلیف پہنچانا سخت گناہ ہے، ایک عورت کو اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر اس کا کھانا پینا بند کر دیا جس سے وہ مر گئی، ایک سفر میں ایک صحابی نے ایسی جگہ چولہا بنایا جہاں چونٹیوں کی بل تھی، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا اس کو جلدی بجھاؤ۔ [۱۱۵] آگ کی سزا دینا صرف خدا کو زیبا ہے۔ [۱۱۶]

جہاد کے ایک سفر میں صحابہ ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے۔ چڑیا بچوں کی محبت میں ان کے گرد منڈلانے لگی۔ رسول اللہؐ نے پوچھا اس کے بچوں کو کس نے پکڑ کر اسے بے قرار کیا ہے؟ ان کو فوراً چھوڑ دو۔ ایک بار آنحضرتؐ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا تو فرمایا ان بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان پر سوار ہوتے ہو تو انھیں اچھی حالت میں رکھ کر سواری کرو اور ان کو کھاتے ہو تو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔ [۱۱۷] جانوروں کو داغنے اور منہ پر مارنے والوں کو رسول اللہؐ نے ملعون قرار دیا ہے۔ [۱۱۸]

آپؐ نے فرمایا ایک شخص کو راستے میں سخت پیاس لگی، اتفاق سے ایک کنواں دیکھا، اس میں اتر کر پانی پیا، باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے زبان نکالے کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس کو اس پر ترس آیا اور دوبارہ کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اسے پلایا، خدا نے اس کے صلے میں اس کو بخش دیا، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی اجر ملتا ہے، ارشاد ہوا کہ ہر جان دار کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ثواب ہے۔ [۱۱۹] ایک صحابی نے آپ سے عرض کیا کہ میں نے اپنے اونٹوں کے

لیے پانی کے حوض بنائے ہیں، بھولے بھٹکے اونٹ بھی اس میں پانی پینے کے لیے آجاتے ہیں، اگر ان کو پانی پلادوں تو کیا مجھ کو ثواب ملے گا، فرمایا ہر پیاسے اور جان دار کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ [۱۲۰] انسان جو درخت لگاتا یا کھیتی کرتا ہے اس کے پھل اور غلے جو انسان یا جانور کھاتا اور چڑیا چگتی ہیں وہ بھی صدقہ ہے۔ [۱۲۱]

اوپر گزر چکا ہے کہ بلاضرورت سرسبز وشاداب اور پھل دار درختوں کو کاٹنے اور جلانے کی ممانعت اسلام نے کی اور حضرت ابوبکر فوجی افسروں کو جنگی مہموں میں بھیجتے وقت اس کی ہدایت بھی فرماتے تھے۔ [۱۲۲] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی رحمت وشفقت حیوانات اور نباتات کے لیے بھی عام ہے۔

اس تحریر میں کہیں کہیں جنگ وجہاد کے الفاظ آئے ہیں اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام نے جنگ اور قتل وخوں ریزی کی حوصلہ افزائی کی ہے جو اس کے دین رحمت ہونے کے منافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے اور وہ دنیا میں ایک پرامن نظام کو دیکھنا چاہتے ہے، انبیاء علیہم السلام کی زندگی اگرچہ گوناگوں واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن نتائج کے لحاظ سے ان تمام واقعات کا مرکز ومحور صرف یہ ہوتا ہے کہ اس خاک دان کو اخلاق رذیلہ کے خس وخاشاک سے پاک کر کے محاسن اخلاق کے گل وریحاں سے آراستہ کیا جائے تاکہ برکات آسمانی کا دامن کانٹوں سے الجھنے نہ پائے، اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کو مادی آلات سے بھی کام لینا پڑا۔ جب محمدؐ کی دعوت حق ملکی سیاست اور قومی مصلحتوں سے ٹکرائی اور آپ کی اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی اور انتشار کے کانٹوں سے الجھا تو مخالفین نے خوں ریز لڑائیاں شروع کر دیں جن کا سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ بالآخر اعجاز نبوت، حسن تدبیر، لطف واخلاق، تائید غیبی اور نصرتِ الٰہی سے تمام معرکے سر ہوگئے اور ایک ایسا پرامن نظام قائم ہوگیا جس میں حق وانصاف کا پرچم لہرانے لگا اور کسی طرح کا کوئی خوف وخطر نہیں رہ گیا:

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

جس طرح ایک راہ گیر کو اپنے راستے سے کانٹوں، روڑوں اور پتھروں کو ہٹانا پڑتا ہے،

آنحضرتؐ کو بھی حق وصداقت کی راہ میں حائل موانع ومزاحمتوں کو دور کرنے کے لیے تیغ وسناں سے کام لینا پڑا۔اسی لیے آپ کی زندگی میں ایک حصہ غزوات ومحاربات کا بھی شامل ہے لیکن ان کا مقصد مال غنیمت اور کشور کشائی نہ تھا۔حکومت وسلطنت کا قیام نہ لوازم نبوت میں ہے اور نہ یہ اسلام میں مقصود بالذات ہے بلکہ دنیا سے شر وفساد کا استیصال،فتنہ بدامنی کا خاتمہ اوران تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹانا جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا ہے۔اس کا مقصد عدل وانصاف کا پرچم لہرانا اور ایسی عادلانہ نظام حکومت قائم کرنا تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ طریقہ حکومت اور سلطنت کے قانون حق وعدل کے بجائے ظلم وجور اور باطل پر مبنی ہوں۔ایسی حکومت کا قیام یقیناً رحمت ہے اوراس کے لیے جنگ وجہاد بھی سرتاپا رحمت ہے،اگر اسلام کا مقصد خوں ریزی اورسفا کی ہوتا تو رسول اکرمؐ اپنے خون کے پیاسوں اوراقراری مجرموں کو قابو میں آجانے کے بعد چھوڑ نہ دیتے جس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں اور فتح مکہ کے دن ان لوگوں کو معاف نہ کرتے جنھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ میں سخت ایذائیں پہنچائیں تھیں،آپ کے قتل کی سازش کی تھی،آپ کو اور مسلمانوں کو وطن سے نکال دیا تھا اور مدینہ میں بھی چین سے رہنے نہیں دیا بلکہ برسہا برس تک لڑائیاں کرتے رہے،لیکن فتح مکہ کے روز ان سب کو معاف کر دیا اور کوئی انتقام نہیں لیا،اس کا حال علامہ شبلیؒ کے پرزور قلم سے سنیے:

> ’’خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے، وہ بھی جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کے تیغ وسناں نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی ہے جنھوں نے آنحضرتؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرتؐ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آآکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے

سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمتِ عالمؐ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا: ”تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں، یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے: 'اخ کریم ابن اخ کریم تو شریف بھائی اور شریف برادرزادہ ہے۔ ارشاد ہوا: **لاتثریب علیکم اذھبوا فانتم الطلقاء** تم پر آج کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔[۱۲۳]

جان کے دشمنوں اور خون کے پیاسوں کے ساتھ عفو و درگزر کا یہ نمونہ کبھی چشم عالم نے نہ دیکھا ہوگا۔ آپؐ نے اتنے شدید مخالفین اور شر پر آمادہ لوگوں کو کبھی برا بھلا نہیں کہا، آپ کی زبان سے یہی دعا نکلتی تھی کہ ”خداوند میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ حق و ناحق کو نہیں جانتی۔“ ایک دفعہ مشرکین کے مظالم سے تنگ آکر صحابہ نے آپ سے بددعا کی درخواست کی تو فرمایا: ”میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“[۱۲۴]

دنیا کے عام فاتح اور حکمراں خراج نہ دینے، بغاوت کرنے اور بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں لیکن سلطنت کے بدخواہوں اور غداروں کو معاف نہیں کرتے مگر رحمت عالمؐ نے ایسے بدخواہوں اور غداروں کو بھی معاف کر دیا۔ آپؐ کے ایک صحابی حاطب بن بلطعہ سے ایسی ہی غلطی سرزد ہوئی، انھوں نے صلح حدیبیہ کے زمانے میں کفار قریش کو ایک خط لکھا جس میں مسلمانوں کے مخفی حالات کی اطلاع ان کو دی گئی تھی مگر وہ خط پکڑ لیا گیا۔ حضرت عمرؓ بہت غضب ناک ہوئے عرض کی یا رسول اللہؐ اس منافق کی گردن اڑانے کی اجازت دیجیے، آپ نے حاطب سے پوچھا تم نے یہ کیا کیا، انھوں نے کہا بہ خدا میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں، یہ خط اس لیے لکھا تھا کہ مکہ میں جو مہاجرین اپنی اولاد کو چھوڑ کر چلے آئے ہیں ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہیں تھا اس لیے میں نے چاہا کہ قریش پر ایک احسان کردوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، ارشاد ہوا تم سچ کہتے ہو اور صحابہ سے فرمایا کہ ان کی نسبت اچھے الفاظ استعمال کرو اور بدگمانی کو راہ نہ دو، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا اس نے خدا اور رسول اور مسلمانوں

سے خیانت اور غداری کی ہے، اجازت دیجیے اس کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا کیا وہ اہلِ بدر سے نہیں ہیں جن کے بارے میں خدا نے کہا ہے: **اُعملوا ما شئتم** [۱۲۵] (تم جو چاہو کرو) یہ سن کر حضرت عمر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ [۱۲۶]

شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور اس کے خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی یہی دستور تھا مگر اسلام کے قانون الٰہی کی اصل تعمیل کا نمونہ اس کا رسول اور اس کے گھر والے تھے، اللہ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ ان سے کوئی جرم سرزد ہو تو ان کے لیے دوہری سزا ہے، ایک بار خاندان مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرتؐ نے ان کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ ایک معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ کو یہ گراں گزرا اور انھوں نے حضرت اسامہ کو آپ کے پاس سفارش کے لیے بھیجا کیونکہ وہ آپ کے چہیتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی مگر وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے پھر فرمایا خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ [۱۲۷]

اس سے معلوم ہوا کہ جو جنگ حق وانصاف اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کی جائے وہ اسلام کی رحمت کا ایک مظہر ہے۔ اسی طرح حدود وتعزیرات یعنی قتل کا قصاص، چوری اور زنا وغیرہ کی سزائیں بھی اپنے نتیجے کے لحاظ سے رحمت ہیں۔

حواشی

۱۔ سورۂ مائدہ، آیت:۳
۲۔ سورہ احزاب، آیت:۴۰
۳۔ سورہ سبا، آیت ۲۸
۴۔ سورۂ اعراف، آیت:۱۵۸
۵۔ صحیح مسلم، باب المساجد
۶۔ سورہ انبیاء، آیت:۱۰۷
۷۔ سورۂ مومن، آیت:۱۷
۸۔ سورۂ انعام، آیت:۱۲و۵۴
۹۔ صحیح بخاری، کتاب المحاربین، باب اذا اقر بالحد ولم یبین
۱۰۔ سورہ بنی اسرائیل، آیت:۷۰
۱۱۔ سورہ حجرات، آیت:۱۳
۱۲۔ عقد الفرید، ج:۲، ص:۱۱
۱۳۔ ابوداؤد، باب التفاخر بالاحساب
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول اللّٰہ
۱۶۔ زرقانی، جلد:۴، ص:۳۱۹
۱۷۔ مسند احمد بن حنبل، ج:۳، ص:۱۵۳
۱۸۔ سورہ بقرہ، آیت:۲۰۱
۱۹۔ سورہ بقرہ، آیت:۲۸۶
۲۰۔ سورہ بقرہ، آیت:۱۸۵
۲۱۔ حج:۲۲/۷۸
۲۲۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب قول النبیؐ یسروا ولا تعسروا
۲۳۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان
۲۴۔ بخاری کتاب الصوم باب حق الجسم فی الصوم وباب صوم الدھر وباب حق الاھل فی الصوم وباب صوم داؤد
۲۵۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب اذا صلی لنفسہ

۲۶۔ بخاری، کتاب الحج، باب من نذر المشی الی الکعبة
۲۷۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰة باب الرخصة فی المطر و العلة ان یصلی فی رحله
۲۸۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح
۲۹۔ سورۂ مائدہ، آیت ۸۷-۸۸
۳۰۔ سورۂ اعراف، آیت:۳۱
۳۱۔ سورۂ نساء، آیت:۱۰۵
۳۲۔ سورۂ نساء، آیت:۱۳۵
۳۳۔ سورۂ مائدہ، آیت:۵-۸
۳۴۔ سورۂ نساء:۴/۱۳۵
۳۵۔ سورۂ نور، آیت:۲
۳۶۔ صحیح بخاری
۳۷۔ سورہ شوریٰ، آیت:۴۰ وسورہ نحل: آیت ۱۲۶
۳۸۔ ترمذی، باب ماجاء فی خلق النبیؐ
۳۹۔ ادب المفرد باب العفو و الصفح عن الناس
۴۰۔ سورہ نحل، آیت ۹۰
۴۱۔ سورہ قصص، آیت:۷۷
۴۲۔ صحیح بخاری، ابواب البر و الصلة باب ماجاء فی رحمة الناس
۴۳۔ ادب المفرد باب من لا یرحم الا یرحم
۴۴۔ سورہ بقرہ، آیت:۵، اور آیت:۸۳ وسورہ بنی اسرائیل، آیت:۵۳
۴۵۔ سورہ طہٰ، آیت:۴۴
۴۶۔ مسلم، کتاب البر و الصلة باب تحریم الظلم
۴۷۔ بخاری، کتاب المظالم باب الاتقا و الحذر من دعوة المظلوم
۴۸۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب من وصل وصله اللّٰه
۴۹۔ سورہ بنی اسرائیل، آیت:۲۶
۵۰۔ ادب المفرد باب صلة رحم
۵۱۔ بخاری، کتاب الادب باب لیس الواصل بالمکافی
۵۲۔ سورہ بنی اسرائیل، آیت:۲۴
۵۳۔ سورہ لقمان، آیت:۱۵ وسورہ عنکبوت، آیت:۸
۵۴۔ بخاری، کتاب الادب با وحینا الانسان بو الدیه

۵۵۔ مسلم، كتاب البر والصلة باب بر الوالدين وانهما احق به

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ سورہ احقاف، آیت:۱۵

۵۸۔ بخاری، كتاب الادب باب ووصينا الانسان بوالديه

۵۹۔ سورہ بنی اسرائیل، آیت:۳۱

۶۰۔ سورہ انعام، آیت:۱۴۰

۶۱۔ سورہ تکویر:۸۱/۸

۶۲۔ صحیح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب باب فضل الاحسان الى البنات

۶۳۔ ابوداؤد، كتاب الادب باب فضل من عال يتيما

۶۴۔ ترمذی، ابواب البر والصلة باب ماجاء فی ادب الولد

۶۵۔ مسلم، باب الوصية بالثلث

۶۶۔ سورہ نساء، آیت:۳

۶۷۔ سورہ نور، آیت:۳۲

۶۸۔ سورہ روم وسورہ بقرہ، آیت:۲

۶۹۔ سورہ بقرہ، آیت:۲۲۸

۷۰۔ سورہ نساء، آیت:۳۴

۷۱۔ سورہ نساء، آیت:۱۹

۷۲۔ صحیح بخاری، باب المداراة مع النساء وقول النبی انما المرأة كا لضلع

۷۳۔ سورہ نساء، آیت:۳۵

۷۴۔ سورہ نساء، آیت:۱۴

۷۵۔ صحیح مسلم

۷۶۔ مسلم، باب فی رحمة النبی عليه السلام للنساء و امر السواق مطا يا هن بالرفق لهن

۷۷۔ نور:۲۴/۲

۷۸۔ صحیح بخاری، كتاب الطلاق باب شفاعته النبیؐ

۷۹۔ سورہ نساء، آیت:۴

۷۹۔ بخاری، كتاب الاجاره باب منع اجر الآجر

۸۱۔ سورہ بقرہ، آیت:۲

۸۲۔ بخاری، باب قول النبی العبيد اخوانكم فاطعمو هم ما تاكلون

۸۳۔ كتاب الايمان باب الطعام والمملوک مما ياكل

۸۴۔ بخاری،ابو اب المظالم باب من ادب جاریتها و علمها
۸۵۔ مسند احمد، ج:۳
۸۶۔ بخاری، کتاب الادب باب اثم من لا یامن جاره بو ائقه
۸۷۔ ادب المفرد باب لا یشبع دو ن جاره
۸۸۔ ایضاً،باب الوصایا بالجاد
۸۸۔ ایضاً، باب لایوذی جاره
۸۹۔ صحیح بخاری، کتاب الادب ما ینهی عن التحاسد
۹۰۔ ایضاً، باب الایمان یحب لاخیه ما یحب لنفسه
۹۱۔ بخاری، کتاب الایمان باب الدین النصیحة
۹۲۔ ابوداؤد، کتاب الادب باب افشاء السلام
۹۳۔ ایضاً،باب المصافحة
۹۴۔ مسلم، کتاب السلام باب من حق المسلم للمسلم رد السلام
۹۵۔ طبرانی
۹۶۔ ترمذی،ابو اب البر و الصله باب ماجاء فی الحسد
۹۷۔ مسند احمد، ج:۳،ص:۳۷۲
۹۸۔ مسلم، کتاب ا لبر و الصله باب فضل عیاة المریض
۹۹۔ سوره انفال، آیت:۸
۱۰۰۔ سوره توبہ، آیت:۹
۱۰۱۔ سوره توبہ، آیت:۹
۱۰۲۔ تاریخ طبری:۴/۲۲۳۱
۱۰۳۔ ابوداؤد، کتاب الجهاد باب فی النهی عن النهب
۱۰۴۔ طبقات ابن سعد تذکره عمیر بن وهب
۱۰۵۔ استیعاب،ص:۳۵۲
۱۰۶۔ اصابه! تذکره هبار بن الاسود
۱۰۷۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب وفد بنی حفیفه و حدیث ثمامه بن آثال
۱۰۸۔ سیرت ابنِ ہشام، ج:۲،ص:۴۲۰
۱۰۹۔ طبری، ج:۴،ص:۲۵۴۴
۱۱۰۔ سنن بیہقی، ج:۸،ص:۳۰-۳۱
۱۱۱۔ کتاب الخراج،ص:۸۴

۱۱۲۔ ایضاً،ص:۸۰
۱۱۳۔ مستدرک، کتاب ،النکاح، باب اعظم الاذنوب عند الله، ج:۲
۱۱۴۔ مسلم، کتاب الصید والذبابح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشقرۃ
۱۱۵۔ ابوداؤد، کتاب الجھاد باب حرق الورو فی النار
۱۱۶۔ مسند احمد، جلد: اول
۱۱۷۔ سنن ابوداؤد، کتاب الجھاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب
۱۱۸۔ ایضاً، باب وسم الدواب
۱۱۹۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبھایم
۱۲۰۔ ابن ماجہ، باب فضل صدقۃ الماء
۱۲۱۔ بخاری، ابواب الحرث والزارعۃ باب فضل الزرع والفرس اذا کل منہ
۱۲۲۔ تاریخ الخلفاء، سیوطی، ص:۹۶
۱۲۳۔ سیرت النبی حصہ اول، ص:۲۰-۱۹، طبع چہارم
۱۲۴۔ مشکٰوۃ، باب فی اخلاقہ وشمائلہ
۱۲۵۔ سورہ حم السجدہ، آیت:۴۰
۱۲۶۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی فضل من شھد بدرا، ج:۲، ص:۵۶۷
۱۲۷۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب کراھیۃ الشفاعۃ...، جلد:۲، ص:۱۰۰۳

پروفیسر سید مسعود احمد *
ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی **

سورۃ النحل کی آیت امر و نہی میں
آفاقیت قرآن کی چند جھلکیاں

قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ آخری صحیفہ ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہر انسان کی انفرادی و اجتماعی اور اخلاقی و قانونی ہر میدان میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ جب ہم قرآن مجید کی آفاقیت کو کسی خاص آیت میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں بھی آفاقیت کا تصور واضح ہونا چاہیے جو ہمارے نزدیک صرف اس کی عالمگیریت و ہمہ جمعیت اور تا قیامت مکمل رہنمائی تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام مکلّف مخلوقات کی فطرت اور لطیف جذبات و احساسات نیز کائنات کے ساتھ ان کے توافق و ہم آہنگی اور ساز گاری کے بیان تک وسیع ہونا چاہیے۔ مزید برآں ان تمام مکلّف مخلوقات اور خصوصاً انسان کا جامع تصور فوز وفلاح، اس کے تصورات امن و آشتی نیز سکون قلب اور فرحت و مسرت کا بھی قرآن مجید کو مدعی بلکہ علم بردار ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر وہ کتاب نہ صرف تا قیامت مخلوقات کی ہدایت عامہ اور ہدایت تامہ کی علم بردار ہو یعنی جس میں ہر شعبہ حیات اور ہر لمحہ زندگی کی حقیقی و کامل ہدایت لازماً شامل ہو اور ہدایت کی ترسیل میں عقلی استدلال، قلبی اپیل نیز فرد و معاشرہ

* ڈائرکٹر آفاقیت قرآن پروجیکٹ ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

** پروجیکٹ فیلو ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

دونوں کے لیے یکساں کشش کے سامان ہوں۔ ان تمام معروف اقدار وعوامل میں عدل واحسان کے قیام کے ساتھ ساتھ منہیات کی رعایت ملحوظ رکھنے کے لیے قرآن مجید کی تعلیمات کا ایک مرکزی اور بنیادی اصول عدل، احسان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی ہے۔ قرآن حکیم نے صالح معاشرے کی تشکیل کے لیے جو خطوط متعین کیے ہیں ان سے بچنا بھی شامل ہے۔ سورہ النحل کی آیت ۹۰ کے اندر جن تعلیمات کو بیان کیا گیا ہے ان میں جہاں فکری ونظریاتی سطح پر حسن و جمال کا چشمہ رہا ہے تو وہیں اس آیت کے اسلوب وترتیب کا ظاہری حسن بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کو اس طرح سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں تین چیزیں ایجابی ہیں اور تین چیزیں سلبی ہیں جو ترتیب میں اعتدال کے پہلو کو ظاہر کر رہی ہیں کیونکہ بیان مضامین میں یک گونہ برابری یا میزانی مساوات بھی ایک طرح کا حسن ہے اور کسی بھی کلام میں حسن و جمال کا پایا جانا اس کی عظمت وآفاقیت کی واضح علامت ہے۔ اگر ہم اس آیت کریمہ میں معنوی سطح پر غور کرتے ہیں تو بھی یہ آیت آفاقیت کا مرقع نظر آتی ہے مثلاً سماج میں امن وامان اور معاشرتی توازن قائم کرنے کے لیے جہاں عدل، احسان اور رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک بنیادی ہے تو وہیں معاشرے سے ان تمام جرائم کو اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے جن سے سماج کے توازن اور اعتدال میں کوئی کمی واقع ہوسکتی ہے۔ منکرات وفواحش اور بغاوت اپنے آپ میں ایسے جرائم ہیں جو سماج میں بد اخلاقی اور بدامنی پھیلاتے ہیں۔ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسلوبیاتی وتعلیماتی حسن و جمال کا جو مرقع پیش کیا ہے وہ معنوی اور ظاہری دونوں اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ سورۃ النحل کی آیت ۹۰ میں سب سے پہلے عدل کا ذکر کیا گیا ہے، یہاں امر میں تقدیم عدل کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ قرآن کا تصور عدل ایک عالمگیر، ہمہ گیر، اور فطرت سے ہم آہنگ آفاقی اصول ہے۔ یہ اصول صرف عدالتوں میں انصاف پر زور نہیں دیتا بلکہ ہر انسان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی نجی اور اجتماعی زندگی میں عدل کو معیار بنائے۔ درحقیقت اسلامی معاشرے کی سب سے اہم اور ناگزیر بنیاد قیام عدل ہے جو اس آیت کی ترتیب سے بھی واضح ہے۔ جب تک عدل قائم نہ ہو نہ دین مکمل ہوسکتا ہے اور نہ ہی انسانیت محفوظ رہ سکتی ہے۔ اسی طرح یہ آیت قرآنی اخلاقیات کی ایک بنیادی کڑی ہے، جو انسان کی انفرادی، اجتماعی، اخلاقی، اور سیاسی زندگی کو سنوارنے کے لیے جامع اصول فراہم کرتی ہے۔

مزید برآن احسان کے کلمہ میں حیات انسانی کے حسن و جمال کی جو وسعتیں پنہاں ہیں ان کا احاطہ چند سطور میں ممکن نہیں، اسی طرح ذوی القربیٰ میں انسانی فطرت کی جو رعایت صلہ رحمی کی شکل میں اجاگر ہوسکتی تھی وہ بدرجہ اتم موجود ہے، لہٰذا ان تینوں احکام الٰہی میں آفاقیت قرآن کا جو دلکش منظر چشم بصیرت میں ابھرتا ہے وہ ناقابل بیان ہے، لیکن اسے تکمیل کو پہنچانے میں جس اظہار بیان کی ضرورت تھی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح منہیات میں جو موضوعاتی حسن انتخاب اور جمالیاتی اظہار بیان پایا جاتا ہے وہ بھی غیر معمولی ہے۔

مزید برآں اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے موعظہ کا اسلوب اختیار کیا ہے جو بذات خود تمام مخلوقات کی فطرت سے ہم آہنگ ایک طے شدہ آفاقی صفت ہے۔

آیت کے مضامین کا تعارف

یہاں اللہ تعالیٰ اصولی طور پر سب سے پہلے عدل کا حکم دے رہا ہے، جو اس امر کا مستلزم ہے کہ ہر ایک کے ساتھ یکساں اخلاقی سلوک کرنا، ہر حق دار کو اس کا پورا حق دینا اور کسی سے زیادتی نہ کرنا قرآنی تعلیمات کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اس معاشرے میں عدل کی بنیاد پر امن وامان قائم ہوتا ہے، اس آیت میں دوسرا حکم احسان کرنے کا دیا گیا ہے۔ یہ عدل سے آگے کا درجہ ہے۔ بالخصوص معاملات میں جو کچھ ہمارے ذمہ فرض ہے وہ ہم پورا ادا کریں۔ احسان یہ چاہتا ہے کہ اپنے ذمہ حق سے زیادہ اپنی خوشی سے اس کی ادائیگی ہو، دوسروں کے ساتھ خندہ پیشانی اور بھلائی کا معاملہ کیا جائے، دشمن کو معاف کیا جائے اور ہر محتاج کی مدد کی جائے۔ تیسری چیز اس آیت میں رشتے داروں کے حقوق سے متعلق ہے۔ یہ عام حکم ہے کہ ہر انسان اپنے قرابت داروں کو ان کا حق دے، ان کی ضروریات کا خیال رکھے، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ مزید برآں اس آیت میں تین برائیوں سے بچنے اور دور رہنے کا حکم بھی ہے، جو حسبِ ذیل ہے:

فحشاء : اس آیت میں ہر قسم کی جنسی بے راہ روی، فحش گفتگو اور غیر اخلاقی رویے شامل ہیں۔ یہ فرد و معاشرے کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔

منکر : ہر وہ عمل ہے جسے عقل، شریعت اور فطرت برا سمجھے مثلاً جھوٹ، چوری، دھوکہ اور

شرک وغیرہ۔

بغیٌ: کا مطلب ہے بغاوت وخروج کرنا،ظلم وتعدی کرنایا طاقت کا غلط استعمال کرنا۔

اللہ تعالیٰ ان غیر اسلامی اور غیر اخلاقی افعال کو سختی سے منع فرماتا ہے۔ چنانچہ یہ آیت ایک نصیحت ہے، جو انسان کو ایک مہذب، عادل، پرامن اور محبت بھرا معاشرہ قائم کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ آیت نہ صرف تین بڑے اوامر اور نواہی کی یاددہانی کراتی ہے بلکہ ترجیحی بنیاد پر ایک ترتیب بھی قائم کرتی ہے۔

اگر کوئی انسان یا قوم اس آیت کو اپنی زندگی کا دستور بنالے، تو نہ صرف اس کی دنیا سنور جاتی ہے بلکہ آخرت میں بھی کامیابی یقینی ہوجاتی ہے۔

آیت کریمہ کی جہات وابعاد چند متداول تفاسیر کی روشنی میں

قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں بعض مثبت اور منفی رویوں اور قدروں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کی عالم گیریت اور آفاقیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی یہ آیت اپنے اندر جو وسعت وجامعیت اور حسن وجمال رکھتی ہے وہ آیت کے معنی ومفہوم سے صاف ظاہر ہے۔ ان آفاقی جہات وابعاد کے واضح اشارے کتب تفسیر میں خوب ملتے ہیں، چند مثالیں ذیلی سطور میں ملاحظہ فرمائیں:

اس آیت کی تفسیر وتشریح چند متداول تفاسیر کی روشنی میں پیش کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متن آیت اور اس کا ترجمہ پیش کردیا جائے:

إِنَّ اللّٰـهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِيْ الْقُرْبَى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ.

(بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور ذوی القربیٰ کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو)

اس آیت کے ذیل میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے رقم فرمایا ہے:

''عدل، احسان، **ایتاء ذی القربیٰ** 'عدل' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے

تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال وانصاف کی ترازو میں تلے ہوں، افراط وتفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے۔ 'احسان' کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل وعفو اور تلطف وترحم کی خو اختیار کرے، فرض ادا کرنے کے بعد تطوع وتبرع کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کرے، اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا اسے اللہ دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا۔

'الأحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراک' (صحیح بخاری) **'ھل جزاء الاحسان الا الاحسان'** یہ دونوں خصلتیں (یعنی عدل واحسان یا بالفاظ دیگر انصاف ومروت) تو اپنے نفس اور ہر ایک خویش و بیگانہ اور دشمن سے متعلق تھیں۔ لیکن اقارب کا حق اجانب سے کچھ زائد ہے۔ جو تعلقات قرابت قدرت نے باہم رکھ دیئے ہیں انھیں نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اقارب کی ہمدردی اور ان کے ساتھ مروت واحسان اجانب سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہیے۔ صلہ رحمی ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب وذوی الارحام کے لیے درجہ بدرجہ استعمال ہونی چاہیے۔ گویا 'احسان' کے بعد ذوی القربیٰ کا بالتخصیص ذکر کر کے متنبہ فرما دیا کہ عدم انصاف تو سب کے لیے یکساں ہے۔ لیکن مروت واحسان کے وقت بعض مواقع بعض سے زیادہ رعایت واہتمام کے قابل ہیں۔ فرق مراتب کو فراموش کرنا ایک طرح قدرت کے قائم کیے ہوئے قوانین کو بھلا دینا ہے۔ اب ان تینوں لفظوں کی ہمہ گیری کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھ دار آدمی فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کون سی فطری خوبی، بھلائی اور نیکی دنیا میں ایسی رہ گئی ہے جو ان تین فطری اصولوں کے احاطہ سے باہر ہو ''فحشاء ومنکر: منع بھی تین چیزوں سے کیا فحشاء، منکر بھی۔ کیونکہ انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے ساری خرابیاں اور برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قوت بہیمیہ شہوانیہ، قوت وہمیہ شیطانیہ، قوت غضبیہ سبعیہ غالباً '**فحشاء**' سے وہ

بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشاء شہوت و بہیمیت کی افراط ہو۔ ' منکر' معروف کی ضد ہے۔ یعنی نا معقول کام جس کا فطرت سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے۔ گویا قوت وہمیہ شیطانیہ کے غلبہ سے قوت عقلیہ ملکیہ دب جائے۔ تیسری چیز 'بغی' ہے یعنی سرکشی کر کے حد سے نکل جانا۔ ظلم وتعدی پر کمر بستہ ہو کر درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے کو دوڑنا اور دوسروں کے جان و مال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا۔ اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غضبیہ کے بیجا استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ الحاصل آیت میں تنبیہ فرما دی کہ انسان جب تک ان تینوں قوتوں کو قابو میں نہ رکھے اور قوت عقلیہ ملکیہ کو ان سب پر حاکم نہ بنائے، مہذب اور پاک نہیں ہو سکتا۔

اکثم بن صفی نے اس آیت کریمہ کو سن کر اپنی قوم سے کہا: ''میں دیکھتا ہوں کہ یہ پیغمبر تمام عمدہ اور اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور کمینہ اخلاق اور اعمال سے روکتے ہیں۔ تو تم اس کے ماننے میں جلدی کرو۔" فکونوا فی ھذا الامر روسا ولا تکونوا فیه اذنابا" یعنی تم اس سلسلہ میں سربراہ بنو، دم (پیچھے چلنے والے) نہ بنو۔ حضرت عثمان بن مظعون فرماتے ہیں کہ اس آیت کو سن کر میرے دل میں ایمان راسخ ہوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں ہوئی''۔[1]

زیر بحث آیت کے ذیل میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے محولہ بالا حواشی بلاشبہ اتنے جامع اور برمحل ہیں کہ ان پر مزید کچھ اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بالخصوص آیت کی اس تفسیر میں آفاقیت قرآن کی جھلک بھی جابجا نظر آتی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک طویل اقتباس ہے جس میں وہ اس آیت کو سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۲۹-۲۲ کے ساتھ دیکھنے کی سفارش کرتے ہیں البتہ آغاز اس طرح کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

> ''یہ عظیم آیت تمام قرآنی اوامر و منہیات کا خلاصہ ہے۔ قرآن جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان کی بنیادیں بھی اس میں واضح کر دی گئی ہیں اور جن چیزوں سے وہ روکتا ہے ان کی اساسات کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ تمام قرآنی اوامر کی بنیاد عدل، احسان اور ذوی القربیٰ کے لیے انفاق پر ہے اور اس کی منہیات میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کے اندر فحشاء، منکر اور بغیؔ کی روح فساد پائی جاتی ہے۔ یا اس کا حوالہ دینے سے مقصود ان لوگوں کو متنبہ کرنا ہے جو

قرآن کی مخالفت میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے تاکہ وہ سوچیں کہ جس چیز کی وہ مخالفت کر رہے ہیں اس کی تعلیم کیا ہے اور اس کی مخالفت سے کسی عدل و خیر کی مخالفت اور کسی شر و فساد کی حمایت لازم آتی ہے۔'' [۲]

مولانا اصلاحی آخر میں اس آیت کے تینوں اوامر اور تینوں منہیات کو جدا جدا لے کر ان کے معانی و مفاہیم بیان کرتے ہیں۔ [۳]

قرآن کریم کی اس آیت کے آفاقی پہلوؤں پر اشارہ کرتے ہوئے پیر کرم شاہ ازہری اپنی معروف تفسیر 'ضیاء القرآن' میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''یہ آیت جب نازل ہوئی تو اسلام کے بڑے بڑے دشمن اس کے اعجاز اور جامعیت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کو پڑھ کر سنائی تو اس نے کہا 'یا ابن اخی' (میرے بھتیجے ایک بار پھر پڑھو) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھر پڑھا تو وہ دشمن اسلام اور منکر قرآن یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔" **والله ان له لحلاوة وإن عليه لطلاوة وإن اصله المورق واعلاه لمثمر وما هو بقول بشر.**''

(بخدا یہ تو بڑی شیریں ہے۔ اس کا ظاہر بڑا رنگین ہے۔ اس کا تنا پتوں والا ہے اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں۔ بخدا یہ کسی بشر کا کلام نہیں)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''**هذه اجمع آية في القرآن لخيره يتمثل ولشر يجتنب**'' یہ قرآن مجید کی وہ جامع ترین آیت ہے جس میں ہر اس بھلائی کا حکم موجود ہے جس پر عمل ضروری ہے اور ہر برائی سے بچنے کی ہدایت ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔

یہ اسی کتاب مقدس کی ایک آیت ہے جس کے متعلق اس کے نازل فرمانے والے نے فرمایا یہ ''**تبيانا لكل شيء**'' ہے۔ اسی لیے اس میں ہمیں بھی زیادہ سے زیادہ غور کرنا چاہیے تاکہ اس بیش قیمت خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہوسکیں۔ [۴]

پیر کرم شاہ ازہری نے اس آیت کے آفاقی پہلو کو یہاں خصوصاً اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ

اس آیت کی جامعیت ومعنویت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان پر عمل کر کے ایک صحت مند اور صالح معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔ مزید برآں ان کے نزدیک اس آیت کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ آیت کریمہ میں مذکور مضامین کی اہمیت وافادیت اور ان کی عظمت وجلالت کا اعتراف اس وقت ان لوگوں نے بھی کیا جو خود قرآن کریم پر اعتراض کرتے تھے اور اسے کلام الٰہی ماننے سے انکار کرتے تھے۔

فی ظلال القرآن میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر بڑی دلکش وجامع انداز میں کی گئی ہے:

'یہ کتاب' عدل کا حکم دیتی ہے جس سے ہر فرد، ہر جماعت اور ہر قوم کے حق میں تعامل کا ایک ایسا پختہ اصول سامنے آتا ہے جو نہ تو خواہش نفس کا کبھی شکار ہو سکتا ہے، نہ محبت اور نفرت کے جذبات سے متاثر ہو سکتا ہے اور نہ ہی رشتہ داری اور اقربا پروری کی رعایت اور امیری وغریبی اور طاقت وکمزوری کے لحاظ سے ردوبدل کا نشانہ بن سکتا ہے۔ یہ بے لاگ طریقے سے کام کرتا ہوا سب کو ایک ہی پیمانے سے ناپتا اور سب کے لیے انصاف کا ایک ہی معیار قائم کرتا ہے۔

پھر 'عدل' کے پہلو بہ پہلو 'احسان' ہے، جس سے عدل قاطع کی حدت میں تھوڑی سی نرمی پیدا ہو جاتی ہے اور اس شخص کے لیے مساحت کا دروازہ کھلا رہتا ہے جو اپنے بعض حقوق سے اس لیے دست بردار ہونا چاہے کہ اس سے دلوں کی محبت قائم رہے اور سینوں کی کدورت زائل ہو جائے اور اس شخص کے لیے بھی اجازت کا در، وا رہتا ہے جو اس حق سے بڑھ کر دینا چاہے جس کی ادائیگی اس پر از روئے عدل لازم آتی ہو اور اس لیے دینا چاہے کہ اس سے کسی زخم کا مداوا کر سکے یا اعلیٰ اخلاق کا اظہار اس کے پیشِ نظر ہو۔ لفظ احسان کا مفہوم بہت وسیع ہے اور ہر اچھا کام احسان ہے۔ احسان کے اس حکم میں ہر قسم کا نیک عمل اور ہر طرح کا کریمانہ سلوک شامل ہے۔ اسی لیے یہ پوری زندگی کے معاملات پر محیط ہے، خواہ بندے کا

اپنے رب سے تعلق ہو یا اپنے خاندان، معاشرے اور پوری انسانیت سے۔ اسے ہر جگہ احسان کے درجے پر فائز ہونے کی نصیحت کی گئی ہے۔

احسان کے بعد 'قرابت داروں پر انفاق' کا حکم دیا گیا ہے اور اس حکم کو نمایاں کرنے کی وجہ اس کی اہمیت اجاگر کرنا ہے اور اس پر زور دینا ہے۔ اس حکم کی بنیاد خاندانی عصبیت نہیں، بلکہ کفالت باہمی کے اصول پر عمل ہے جسے اسلام مقامی سطح سے بتدریج پوری سوسائٹی تک عام کرتا جاتا ہے اور اس کفالت باہمی کی فروغ کے لیے اسلام کا اپنا تنظیمی نظریہ ہے۔ [۵]

سید قطب شہید کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں عدل واحسان اور انفاق ذوی القربی کا حکم دے کر سماج سے بدامنی، بدعنوانی اور ہر طرح کی زیادتی کا خاتمہ مقصود ہے۔ مذکورہ بالا تینوں اصولوں پر عمل کر کے معاشرے میں فکری وروحانی توازن قائم ہوسکتا ہے تو وہیں معاشی واقتصادی صورتِ حال کو بھی بہت حد تک بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب سماج کا ہر فرد عدل کے تقاضوں، احسان کا لحاظ اور رشتوں کے حقوق کی ادائیگی کا احساس اور جذبہ رکھتا ہو۔ اس کے بعد سید قطب شہید لکھتے ہیں کہ فحاشی، منکرات اور ظلم پر قائم معاشرہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا: ''کوئی معاشرہ فحاشی، منکر اور ظلم وزیادتی پر قائم نہیں رہ سکتا، جس معاشرے میں فحاشی وبے حیائی کی تمام شکلیں رائج ہوں، منکر اپنی ساری ہلاکت خیزیوں کے ساتھ پھیلا ہوا ہو اور ظلم وناانصافی رواج پاچکا ہو، اس کے برے نتائج کا دور دورہ ہو، اس معاشرے کا قیام وبقاء ناممکن ہے۔''

انسانی فطرت ایک معین مدت کے بعد ان تباہ کن عوامل کے خلاف ضرور اٹھ کھڑی ہوتی ہے، خواہ یہ عوامل کتنے ہی طاقتور ہوں اور ان کی حفاظت کے لیے جابر حکمراں چاہے جس قدر وسائل استعمال کریں۔ پوری انسانی تاریخ فحاشی، منکر اور ظلم کے خلاف بیداری اور صدائے احتجاج سے بھری پڑی ہے۔ لہٰذا اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ تاریخ میں کچھ عرصے کے لیے بعض معاہدے طے پاجائیں اور ان کی بنیاد پر حکومتیں قائم ہوگئی ہوں۔ اس کے خلاف ردِعمل اور احتجاج ہی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ سوسائٹی کے

لیے اجنبی عناصر ہیں۔ انھیں عوام بھگانے کے لیے یکبارگی اٹھ کھڑی ہوتی ہے، جس طرح کوئی ذی روح اپنے اندر داخل ہونے والے ہر اجنبی عنصر کے خلاف حرکت میں آجاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے عدل اور احسان کا حکم اور فحشاء، منکر اور سرکشی کی ممانعت فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے اور اس سے فطرت کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور اسے اللہ کے نام پر مزاحمت پر جدوجہد کی تحریک ملتی ہے۔''[۶]

سید قطب شہید کے نزدیک اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ظلم و جبر اور رذائل کی ترویج و اشاعت کے ساتھ کوئی بھی معاشرہ نہ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ان اس کا وجود دیرپا ہوسکتا ہے۔ معاشروں کے باقی رہنے کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کے اندر عدل وانصاف پر عمل کیا جاتا ہو اور نیکی اور معروف باتوں کی ترویج کی جاتی ہو۔ جب معاشرے میں اخلاق حسنہ اور دیگر نیکیوں کا رواج عام ہوجاتا ہے تو ایسا معاشرہ نہ صرف دیر تک باقی رہتا ہے بلکہ وہ معاشرہ و دیگر تمام معاشروں کے لیے مشعل راہ اور نمونہ عمل بھی ہوتا ہے۔ سید قطب شہید کا یہ مہتم بالشان تبصرہ آفاقیت قرآن کے متلاشی افراد کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

آیت کریمہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مفتی شفیع عثمانی نے زیر بحث آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

''عدل، اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اس کی مناسبت سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے، قرآن کریم میں 'أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ' اسی معنی کے لیے آیا ہے اور اسی لحاظ سے لفظ عدل افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے اور اس کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ عدل کی تفصیل ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہو اور باطن میں بھی اس کا وہی اعتقاد اور حال ہو اور اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ عدل اپنے عام معنی میں ہے، جو ان

سب صورتوں کو شامل ہے جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول ہیں ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔'' [۷]

عدل کے آفاقی مفہوم کو مزید کھول کر آگے تحریر کرتے ہیں:

''لفظ عدل کی اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظ نفس پر اور اس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اس کی ایسی خواہشات پوری نہ کرے جو اس کے لیے انجام کار مضرت رساں ہوں، اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلا وجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور کسی ادنیٰ اعلیٰ معاملے میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لیے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہری یا باطنی طور پر کوئی ایذا اور تکلیف نہ پہنچے۔

اسی طرح ایک عدل یہ ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملے کا محاکمہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور ایک عدل یہ بھی ہے کہ ہر معاملے میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے، ابو عبد اللہ رازی نے یہی معنی اختیار کر کے فرمایا ہے کہ لفظ 'عدل' میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال اور

اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں۔ [۸]

مفتی شفیع صاحب نے عدل کا جو مفہوم بیان کیا ہے اس میں بڑی وسعت اور جامعیت یعنی آفاقیت ہے۔ عدل صرف نزاع کے وقت ہی انصاف اختیار کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ عدل کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایمانیات اور اس کے جملہ تقاضوں، اعمال، عبادات، معاملات اور معاشرت کے تمام پہلوؤں میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرے۔ جب تمام شعبہ حیات میں عدل کو اختیار کیا جائے گا تو یقینی طور پر سماج میں رواداری اور مشفقانہ برتاؤ کی خوشگوار فضا ہموار ہوگی۔ آج سماج یا معاشرے میں کسی بھی طرح کی جو بدامنی یا بدعنوانی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی نظام، دینی روایات اور عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات تک بہت حد تک افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ آیت کریمہ کی روشنی میں ہمیں مذکورہ بالا تمام خطوط پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ ہمارے سماج میں عدل و انصاف کی حقیقی تصویر سامنے آسکے۔

مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں:

> ''دوسرا حکم اس آیت کریمہ میں احسان کے متعلق آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عبادت کا احسان بھی شامل ہے، حدیث جبرئیل کی تشریح کے مطابق، نیز تمام اعمال، اخلاق، عادات کا احسان یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق صحیح اور درست کرنا بھی شامل ہے۔ اسی طرح تمام مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، انسان ہو یا حیوان۔'' [۹]

یعنی اس تناظر میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ احسان کا مطلب یہ ہے کہ ہم نوع انسانی کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کریں۔ یہ حسن سلوک لین دین کے وقت بھی کیا جائے، اسی طرح حاکم اپنی رعایا کے ساتھ حسن سلوک کرے، استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ، اولاد اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔ جب حسن سلوک اور احسان کے اس تصور کے ساتھ زندگی گزاری جائے گی تو یقینی طور پر سماج میں امن و امان اور ہم آہنگی کی فضا ہموار ہوگی جس کی آج بہت بڑی ضرورت ہے۔ یہی ہمارے اور ان کے نزدیک اس آیت کا آفاقی پیغام ہے۔

آیت کریمہ میں تیسرا ایجابی حکم رشتے داروں کو دینے کا ہے۔ اس حوالے سے مفتی شفیع

صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ اس حق میں رشتے دار کو مال دے کر مالی خدمت کرنا بھی داخل، اور جسمانی خدمت بھی، بیمار پرسی اور خبر گیری بھی، زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی، اور اگر چہ لفظ احسان میں رشتہ داروں کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا مگر اس کو اس کی زیادہ اہمیت بتلانے کے لیے علیحدہ بیان فرمایا گیا ہے۔[۱۰] رشتے داروں کے ساتھ رفق ونرمی کی متعدد شکلیں ہیں، جن میں ایک شکل یہ ہے کہ قرابت داروں میں کوئی ضرورت مند ہے تو اس کا مالی تعاون کیا جائے۔ اس کے علاوہ حوصلہ افزائی کرنا، اس کے کسی مصیبت کے وقت میں کلمات تسلی دینا اور ہر وہ عمل جس سے رشتہ دار کو سکون واطمینان حاصل ہوتا ہو وہ یقینی طور پر ذوی القربیٰ میں داخل ہے۔

آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں وہ تعلیمات دی گئیں ہیں جن کا تعلق ممانعت وحرمت سے ہے یعنی یہ وہ اعمال ہیں کہ اگر ان کو اختیار کیا جاتا ہے تو سماج ومعاشرے کا توازن بگڑ جائے گا جس کے نتیجہ میں سماج خرافات اور رذائل کا مرکز بن کر رہ جائے گا۔ وہ ممانعت کی چیزیں درج ذیل ہیں۔

فحشاء ہر ایسے برے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی برائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اس کو برا سمجھے اور منکر وہ قول وفعل ہے جس کے حرام وناجائز ہونے پر اہل شرع کا اتفاق ہو، اس لیے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جاسکتا، اور لفظ منکر میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی عملی اور اخلاقی سب داخل ہیں، اور بغیٌ کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم وعدوان ہے، یہاں اگر چہ لفظ منکر کے مفہوم میں فحشاء بھی داخل ہے اور بغیٌ بھی، لیکن فحشاء کو اس کی انتہائی برائی اور شناعت کی وجہ سے الگ کر کے بیان فرمایا اور مقدم کیا اور بغیٌ کو اس لیے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں تک متعدی ہوتا ہے، اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ وجدل تک یا اس سے بھی آگے عالمی فساد تک پہنچ جاتی ہے۔[۱۱]

مفتی شفیع صاحب کا آیت زیر کے سلسلہ میں بیش قیمتی مباحثہ آفاقیت قرآن کی کتنی گر ہیں کھولنے کا ذریعہ ہے یہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد اس آیت میں آفاقیت قرآن سے متعلق درج ذیل باتیں تحریر کرتے ہیں:

> ''یہ بہت ہی جامع آیت ہے اور اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے انداز میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور تین ہی چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔ پہلا حکم عدل کا ہے اور دوسرا احسان ہے، عدل تو یہ ہے کہ جس کا جس

قدر حق ہے عین اسی قدر آپ اسے دے دیں، لیکن احسان ایک ایسا عمل ہے جو عدل سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ یعنی احسان یہ ہے کہ آپ کسی کو اس کے حق سے زیادہ دیں اور یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ چنانچہ اللہ محسنین کو محبوب رکھتا ہے۔ تیسرا حکم قرابت داروں کے حقوق کا خیال رکھنے کے بارے میں یعنی ان سے حسن سلوک سے پیش آنا، صلہ رحمی کے تقاضے پورے کرنا اور انفاق مال کے سلسلے میں ان کو ترجیح دینا ہے۔ یہ تین احکام ان اعمال کے بارے میں ہیں جو ایک اچھے معاشرے کی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

جن چیزوں سے یہاں منع فرمایا گیا ہے ان میں سب سے پہلے بے حیائی ہے۔ حیا گویا انسان اور ہر برے کام کے درمیان پردہ ہے، جب تک اس پردہ قائم رہتا ہے انسان عملی طور پر برائی سے بچا رہتا ہے اور جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے تو پھر انسان بے شرم ہو کر آزاد ہو جاتا ہے۔ بے حیائی کے بعد منکر سے منع کیا گیا ہے۔ منکر ہر وہ کام ہے جس کے برے ہونے پر انسان کی فطرت گواہی دے۔ تیسرا ناپسندیدہ عمل یا جذبہ بغی یعنی سرکشی ہے یہ سرکشی اگر اللہ کے خلاف ہو تو بغاوت ہے اور یوں کفر ہے اور اگر یہ انسانوں کے خلاف ہو تو اسے 'عدوان' کہا جاتا ہے یعنی ظلم اور زیادتی۔ بہر حال ان دونوں سطحوں پر یہ امتحان ناپسندیدہ اور مذموم جذبہ ہے۔ [۱۲]

مولانا وحید الدین خاں آیت کے آفاقی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"دنیا میں کوئی اللہ کا بندہ کسی طرح رہے، اس کا واضح بیان اس آیت میں موجود ہے۔ اس کی اسی اہمیت کی بنا پر خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس آیت کو جمعہ کے ہفتہ وار خطبہ میں شامل کیا تھا۔

پہلی چیز جس کا ایک شخص کو اہتمام کرنا ہے وہ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا جو حق دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور اور خواہ وہ

پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ، حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔

دوسری چیز احسان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرے میں آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لئے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے، اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔

تیسری چیز ایتاءِ ذوی القربیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس طرح اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو پورا کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے قریبی لوگوں کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحب استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔ اس کے بعد آیت میں تین چیزوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز فحشاء ہے۔ اس سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہے۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے اور لوگ عام طور پر اس کو شرم ناک سمجھتے ہیں۔

دوسری چیز منکر ہے۔ منکر معروف کی ضد ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کو ہر معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مثلا وہ نامعقول کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو انسان عام طور پر برا جانتے ہیں اور جن کو قبول کرنے سے انسان کی فطرت انکار کرتی ہے۔

تیسری چیز بغیٌ ہے۔ اس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ اس میں ہر قسم کی سرکشی داخل ہے خاص طور پر جب کہ آدمی اپنی واقعی حد سے گزر کر دوسرے شخص پر دست درازی کرے۔ وہ کسی کی جان یا مال یا آبرو لینے کے لیے اس کے اوپر ناحق کارروائیاں کرے۔ وہ اپنے زور واثر کو ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کرنے لگے۔ [۱۳]

خلاصۂ کلام

زیر بحث آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے جو تعلیمات ذکر فرمائی ہیں وہ نہ صرف آفاقی

اور عالم گیر حیثیت رکھتی ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر صحیح معنوں میں ان مذکورہ ایجابی اور سلبی تعلیمات پر معاشرے میں عمل ہونے لگے تو وہ سماج یقیناً پائدار امن اور حقیقی اتحاد و یگانگت کا گہوارہ بن جائے گا۔ عدل وانصاف، احسان اور رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک یہ وہ تین آفاقی صفات ہیں جن کو اختیار کر کے انسانی معاشرے کو ترقی میں بہت آگے لے جایا جا سکتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ فحشاء، منکر اور بغی جیسی خرابیوں کو اس ترقی پذیر معاشرے سے دور کر کے کسی بھی سماج کو مثالی اور آئیڈیل بنایا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس کتاب میں ایسی فطرت سے ہم آہنگ بیش بہا تعلیمات ہوں اس کی آفاقیت میں شک و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک تو اس میں آفاقیت کا ایک سمندر موجزن ہے جو صرف قرآن مجید ہی کا یکتا امتیاز ہے۔

مراجع

۱۔ تفسیر عثمانی ـــــ شبیر احمد عثمانی، مکتبہ جاوید دیوبند، ۲۰۰۹ء [جلد: اول] ص: ۷۷۶-۷۷۵

۲۔ تدبر قرآن ـــــ امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، ۲۰۱۴ء [جلد: چہارم] ص: ۴۳۸

۳۔ ایضاً ص: ۴۳۹

۴۔ ضیاء القرآن ـــــ پیر محمد کرم شاہ ازہری، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (نئی دہلی) ۱۹۸۹ء [جلد: دوم] ص: ۵۹۵

۵۔ فی ظلال القرآن ـــــ سید قطب شہید، مترجم: مسیح الزمان ندوی، نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، ۲۰۱۲ [جلد: ۵] ص: ۱۱۴-۱۱۳

۶۔ ایضاً ص: ۱۱۴

۷۔ معارف القرآن ـــــ محمد شفیع عثمانی، عتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء [جلد: پنجم] ص: ۳۷۷

۸۔ ایضاً ص: ۳۷۸-۳۷۷

۹۔ ایضاً ص: ۳۷۸

۱۰۔ ایضاً ص: ۳۷۹

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ بیان القرآن ـــــ اسرار احمد، تاج کمپنی (دہلی) ۲۰۱۲ء، [جلد: چہارم] ص: ۲۶۲

۱۳۔ تذکیر القرآن ـــــ وحیدالدین خاں، مکتبہ الرسالہ (نئی دہلی) ۱۹۸۵ء، ص: ۷۴۲-۷۴۱

ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی*

فی ملکوت کا اردو ترجمہ: ایک جائزہ

مولانا حمید الدین فراہی کی تصانیف دو نوعیت کی ہیں: مکمل اور نامکمل، یعنی بعض تصانیف تمام ہیں اور بعض ناتمام[1] ناتمام تصانیف بھی دو طرح کی ہیں: بعض یادداشت کی صورت میں ہیں اور بعض کے صرف نام ملتے ہیں۔ "**فی ملکوت اللّٰہ**"مولانا فراہی کی ان ناتمام تصانیف میں سے ایک ہے جو یادداشت کے طور پر ان کے متروکہ علمی خزانے میں موجود تھی، جسے مولانا نے اپنی گراں قدر تفسیر "نظام القرآن وتأویل الفرقان بالفرقان" کے مقدمہ کے ایک حصہ کے طور پر لکھنا چاہا تھا۔ مدرسۃ الاصلاح کے ایک نامور فرزند اور اس کے ناظم مولانا بدر الدین اصلاحی مرحوم نے اسی یادداشت کو مولانا فراہی کی بعض دوسری متعلقہ تحریروں کے اضافے کے ساتھ ۱۳۹۱ھ میں مکتبۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) سے شائع کردیا۔ یہ کتاب مقدمہ کے ساتھ کل ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:

"**فعزمت على ان أجمع هذه الآلي وأنظمها ......**"[2]

ترجمہ: چنانچہ میں نے عزم کیا کہ ان گہرہائے آبدار کو جمع کروں اور پھر ان کو

* ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف عربک، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ای میل: azebazmi@gmail.com

ایک رشتہ میں پروکر قرآن کے طالب علموں کے سامنے پیش کروں تاکہ یہ ان کے لیے ایک مفید و مناسب مطالعہ بن جائے۔ چنانچہ میں نے ان کے خزینۂ علم سے ان موتیوں کو چنا اور اپنی فہم وبصیرت کے مطابق اس رسالہ کی شکل میں ان کو مرتب کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام فراہی نے ان اشارات کی صورت میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے جو ملکوت اللہ کے فہم میں کلید کا درجہ رکھتی ہے اور سیاسی قواعد کی تشکیل کے ایک اہم اصول سے ہم کو آگاہ کرتی ہے بشرطیکہ ہم ان پر غور و فکر کریں۔

مولانا فراہی کا یہ مختصر اور ناتمام رسالہ الٰہی حکومت کے اصول وقواعد سے بحث کرتا ہے۔ مولانا نے اس رسالہ میں دین میں علم ملکوت کی اہمیت، اس کے فوائد، اس کے عقلی ونقلی دلائل، اس کی تاریخ، اور دیگر متعلقہ امور سے بحث کی ہے۔

مولانا چونکہ قرآن مجید کے جید عالم تھے اس لیے قرآنی فکر آپ کی زندگی میں اور اس کا اسلوب آپ کی تحریروں میں رچ بس گیا تھا، چنانچہ آپ کی تحریر انتہائی مختصر اور تکلفات سے پاک ہوا کرتی تھی۔[3] اس طرح اس مختصر اور جامع تحریر کا ترجمہ کرنا ایک مشکل امر تھا اس پر مستزاد رسالے کی ناتمامی اور صاحب رسالہ کی فلسفہ سے دلچسپی، چنانچہ ایسے رسالے کا ترجمہ تہ در تہ چیلنجز سے گھرا ہوا تھا۔ الطاف اعظمی مرحوم کو اس حقیقت کا اعتراف تھا چنانچہ انھوں نے خود لکھا ہے:

> ''اس رسالے کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو رسالے کی ناتمامی اور اس کے مباحث کا اجمال واختصار ہے اور دوسری وجہ مولانا فراہی کا اسلوب ہے جس میں حد درجہ ایجاز ہے، اور یہ قرآن کے اسلوب کا واضح اثر ہے جو ایجاز میں منتہائے کمال کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ مزید برآں، مولانا قرآن کے ایک بلند پایہ عالم ومفسر ہونے کے علاوہ قدیم اور جدید فلسفہ سے بھی بخوبی آگاہ تھے اور اس کا اثر بعض مباحث میں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔''[4]

مگر اعظمی مرحوم نے ان تمام رکاوٹوں کو پس پشت ڈال کر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور بتوفیق

الٰہی یہ اردو ترجمہ فروری ۲۰۱۳ء میں دائرہ حمیدیہ سے چھپ کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ گیا، ایک بار مجھ سے اس موضوع پر گفتگو کے دوران اعظمی مرحوم نے بتایا کہ ترجمہ کرنے سے پہلے انھوں نے ترجمہ کے اصول کو بخوبی پڑھا اور پھر اس رسالہ کا بغایت مطالعہ کیا تب جا کر اس کام کو انجام دیا۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ترجمہ پر دو لوگوں نے نظر ثانی کی اور بعض جگہوں پر ان کی اصلاح کو میں نے قبول بھی کیا ہے۔''[۵]

پروفیسر الطاف احمد اعظمی اردو کے ان چند اصلاحی قلم کاروں میں ہیں جن کی تحریر میں معلومات کے ساتھ ساتھ زبان کا اعلیٰ معیار پایا جاتا ہے اور ایک اچھے نثر نگار کے ساتھ ساتھ آپ ایک اچھے خطیب و شاعر بھی ہیں۔ آپ کے تین مجموعہ کلام البلاغ پبلی کیشنز سے شائع ہو کر اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

فی ملکوت اللہ کا اردو ترجمہ اور الطاف اعظمی

قبل اس کے کہ ہم اس ترجمے کی خوبیوں پر روشنی ڈالیں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ ترجمہ مختلف اقسام ترجمہ میں کس قسم سے متعلق ہے۔

فی ملکوت اللہ کے اس ترجمہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اعظمی مرحوم نے لفظی و معنی ترجمے چھوڑ کر توضیحی ترجمہ کیا ہے (سوائے چند جگہوں کے) چنانچہ آپ ضرورت کے مطابق توضیحی جملوں کا اضافہ کرتے چلتے ہیں۔ یہ اضافے کہیں ''یعنی'' کے لفظ کے ساتھ ہوتے ہیں اور کہیں بغیر ''یعنی'' کے اور کہیں بین القوسین۔ جہاں ''یعنی'' کا لفظ بڑھا دیتے ہیں یا اضافہ بین القوسین رکھتے ہیں وہاں تو بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ آیا یہ تشریح یا توضیح ہے یا اضافہ مگر جہاں اس لفظ کا اضافہ نہیں کرتے وہاں یہ تعیین اس قاری کے لیے مشکل ہو جاتی ہے جو یا تو عربی نہیں جانتا اور اگر عربی تو جانتا ہے مگر اس کے پاس اصل نسخہ موجود نہیں ہے۔ چند ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

فهم تاريخ الدنيا و اطمينان القلب بها، و العلم بأنّ الأمور إلى الخير. وهي مسئلة حكمية.[۶]

اس سے تاریخ عالم کا علم حاصل ہوتا ہے اور قلب کو اطمینان ملتا ہے۔ اس

سے اس بات کا بھی علم حاصل ہوتا ہے کہ انجام کار ہر واقعہ خیر پر منتج ہوتا ہے۔ یعنی اس دنیا میں جو واقعہ بھی پیش آتا ہے وہ باعتبار انجام خیر ہوتا ہے۔ اور یہ ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے۔[۷]

اسی بحث کے عنوان کا ترجمہ کرتے ہیں:

منافع العلم في فهم الأمور.[۸]

امور (مختلفہ) کے فہم میں اس علم کے فوائد۔[۹]

المذاهب الباطلة في ملكوت الله کے ذیل میں ایک جملہ ہے:

بل ربما يرون غلبة الجور والفسق وهضم الأبرار وطغيان الفجّار، فمنهم من آمن بالهين كالمجوس.[۱۰]

اور بسا اوقات یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہاں ظلم اور فسق وفجور کا غلبہ ہے اور نیک لوگ مغلوب وشکستہ حال اور فسّاق وفجّار اپنی سرکشی کے باوجود سربلند وبامراد ہیں تو سخت حیرانی سے دوچار ہوتے ہیں اور ان سے عجیب وغریب نتائج اخذ کرتی ہیں اور اس طرح انھوں نے مختلف نظریے قائم کر لیے، مثلاً: ان میں سے ایک گروہ یعنی مجوس کا خیال ہے کہ اس کائنات میں دو معبود ہیں۔[۱۱]

اعظمی مرحوم کے ترجمے کی خصوصیت: مذکورہ کتاب کے ترجمے پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعظمی مرحوم کا یہ ترجمہ مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہے:

۱۔ مفہوم کو دیکھتے ہوئے اضافے یا تہذیب: اعظمی مرحوم کبھی کبھی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے کہیں اضافہ اور کہیں کانٹ چھانٹ کرتے چلتے ہیں۔ اضافہ وتہذیب کا یہ عمل اکثر جگہوں پر مفید اور بامعنی ہوتا ہے، جیسے: "**منشأ المعاصي في النفوس**"[۱۲] کا ترجمہ "نفوس انسانی میں معاصی کی موجودگی اور اس کی غایت"،[۱۳] "**منشأ الآلام والبؤس**"[۱۴] کا ترجمہ "مصائب وآلام کا وجود اور اس کی غایت"،[۱۵] "**نفع هذه العقيده في الأفعال**"[۱۶] کا ترجمہ: "ملکوت اللہ پر اعتقاد کے عملی فوائد"[۱۷] وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ اسی طرح اردو قارئین کو سامنے رکھتے ہوئے کبھی کبھی طویل آیات کو نوٹ نہیں کرتے اور صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں جیسے مولانا فراہی سورۃ الحدید کی مندرجہ ذیل آیات نقل کرتے ہیں۔

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِیُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ٥ لَهُ مُلْکُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ یُحْیِیُ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلَی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ٥ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم ٥ هُوَ الَّذِیُ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِیُ سِتَّةِ أَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِیُ الْأَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَکُمْ أَیْنَ مَا کُنتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِیْر ٥ لَهُ مُلْکُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَی اللَّهِ تُرْجَعُ الأُمُورُ ٥ یُولِجُ اللَّیْلَ فِیُ النَّهَارِ وَیُولِجُ النَّهَارَ فِیُ اللَّیْلِ وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ .[۱۸]

اعظمی مرحوم نے صرف "الذي خلق" تک ہی آیات کو نوٹ کیا ہے مگر ترجمہ پورا کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِیُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ٥ لَهُ مُلْکُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ یُحْیِیُ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلَی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ٥ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم ٥ هُوَ الَّذِیُ خَلَقَ .... آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے وہ اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے، وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کی ہے۔ وہی زندگی اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں بنایا اور پھر عرش پر متمکن ہوا۔ جو چیزیں زمین میں داخل ہوتی ہیں اور جو اس سے نکلتی ہیں اور آسمانوں سے جو کچھ اترتا ہے اور جو کچھ اس میں صعود

کرتا ہے (آسمان کی طرف جاتا)، وہ ان سب کو جانتا ہے۔تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس سے باخبر ہے۔آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ دلوں کے بھید تک سے آگاہ ہے۔''[19]

مزید برآں ان آیات کے ترجمے میں ''ایام'' کا ترجمہ ''دنوں'' سے اور ''بکل شيءعلیم'' کا ترجمہ ''اور وہ ہر چیز سے واقف ہے'' کیا گیا ہے جبکہ فکر فراہی کے مطابق ''ایام'' کا ترجمہ ''ادوار''[20] اور ''علیم بہ'' کا ترجمہ ''بخوبی واقف ہے'' ہونا چاہیے کیوں کہ ''علیم بہ'' کسی چیز سے بخوبی واقف ہونے کو کہتے ہیں۔[21]

۳۔ آپ نے اردو قارئین کا لحاظ کرتے ہوئے جملوں کی ترتیب بھی بدل دی ہے، جیسے: ''**من أعظم المعارف وأهمها التى لا يستقيم التوحيد ولا الدين الحق ولا يطمئن القلب ولا العقل إلا بها، ما هدانا إليه القرآن وجعلها قرينة للتوحيد، هى معرفة ملكوت الرب تعالى وعدله، وإنّ الله تعالى حاكم فى الأرض والسماء، وليس شىء خارجًا عن ملكه، وكل شىء يجرى حسب رضاه وإذنه وتصريفه بالرحمة والعدل والحكمة**''[22] (اصل،ص:۶) ترجمہ: تمام علوم و معارف میں سب سے عظیم اور اہم چیز جس کے بغیر کوئی شخص نہ توحید اور دین حق پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور نہ ہی عقل وقلب کو اطمینان حاصل ہوسکتا ہے اور قرآن نے ان علوم و معارف کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے اور ان کو توحید کے فہم کے لیے ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے، دراصل اللہ کی حاکمیت اور اس کے عدل کی معرفت ہے، یعنی یہ تسلیم کرنا کہ اللہ ہی زمین اور آسمانوں کا حاکم ہے اور کوئی چیز بھی اس کے دائرہ حکومت سے باہر نہیں اور ہر چیز اس کی مرضی کے مطابق کام کر رہی ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، کسی کو مجالِ انکار نہیں۔[23] (ترجمہ،ص:۱۶)

۴۔ ضروری حواشی کا اضافہ: اعظمی مرحوم نے کتاب کے آخر میں ضروری حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے جن سے کتاب کی قیمت اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔اس طرح کے حواشی ص:۶۸ سے ص:۷۲ تک

درج ہیں۔

۵۔ یہی نہیں آپ نے کتاب کے اختصار کو سامنے رکھتے ہوئے فی ملکوت اللہ کے تعارف میں ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جو کسی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکا۔ یہ مقالہ انتہائی مفید ہے اور موضوع پر فکرِ فراہی کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ یہ مقالہ آپ کے مجموعہ مقالات ''مولانا فراہی کے بنیادی افکار'' میں شامل ہے۔[۴۳] کتاب البلاغ پبلی کیشنز سے شائع ہو چکی ہے۔

مندرجہ بالا خوبیوں کے باوصف ترجمے میں کہیں کہیں اصل کے جملے چھوٹ گئے ہیں یا اعظمی مرحوم نے ان کا ترجمہ اس لیے نہیں کیا کہ اردو قارئین کو اس کی ضرورت نہ تھی یا پیراگراف میں اس کی ضرورت نہ تھی جیسے مقدمہ مرتب کے ص:۵ پر ''**ليكون لهم دراسة جديرة في علم الملكوت**'' کا ترجمہ، اصل متن کے ص:۴ پر ''**المؤيد بآل حم**'' کا ترجمہ ص:۴ پر ''**والصالحين من ذريتهم**'' کا ترجمہ، اسی طرح اصل متن میں ص:۵ پر آیت: ''**وإنّ الظن لا يغني من الحق شيئًا**'' کا ترجمہ، وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح بعض جگہوں پر ترجمہ کرنے میں تسامح ہوا ہے جیسے اصل ص:۲۰ پر ''**أكبر غاية الخلق هي إتمام الرحمة وتلزمه الربوبية**'' کا ترجمہ: ''تخلیق عالم کی سب سے بڑی غایت اتمام رحمت اور لزوم ربوبیت'' کیا ہے جو ''تخلیق عالم کی سب سے بڑی غایت اتمام رحمت اور جس کے لیے ربوبیت لازمی قرار پاتی ہے'' ہونا چاہیے اس طرح اصل کے ص:۱۳ پر ''**كيف تسلب الخلافة**'' کا ترجمہ: ''سلبِ خلافت کی وجوہ'' کے بجائے ''خلافت کیوں کر سلب کی جاتی ہے'' کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

اور کہیں کہیں ترجمہ ادھورا ہوا ہے یا پھر غلط جیسے اصل متن کے ص:۵ پر ''**وهي مسألة جامعة للكتاب والحكمة**'' (اس مسئلہ کا تعلق تمام تر کتاب وحکمت سے ہے۔) صحیح ترجمہ اور یہ مسئلہ کتاب وحکمت دونوں کا جامع ہے۔ ص:۴ پر ''**وتمام الرحمة في الدنيا كافلة بإتمامها في الآخرة**'' (ترجمہ: اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں خدا کی رحمت اور اس کا عدل اپنی کامل ترین شکل میں ظاہر ہوں گے۔'') صحیح ترجمہ ہوگا: اور دنیا میں رحمت وعدل کا مکمل ہونا اس بات کا ضامن ہے کہ (اس کی) رحمت آخرت میں بھی کامل ہوگی۔

اسی طرح کہیں کہیں آپ خاص طور سے عنوان میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل بھی نوٹ کردیتے ہیں جیسے کلمہ جامع (عرض مرتب)، آزمائش (فتنہ) وغیرہ وغیرہ مگر ہر جگہ اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام

پروفیسر الطاف احمد اعظمی ہندوپاک کے ایک اہم اسکالر ہیں جن کی تحریر نہ صرف معلومات بلکہ زبان کے اعلی معیار پر مبنی ہوتی ہے۔ اس خوبی کے ساتھ ساتھ آپ ایک بہترین خطیب اور نباض بھی تھے۔ آپ نے طب یونانی کی تاریخ وفلسفہ وحکمت پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اقبالیات اور آزادیات پر آپ کی تحریریں قابلِ تقلید ہیں اور ان دونوں میدانوں میں تحقیق وتنقید کا نیا باب وا کرتی ہیں۔ آپ کی تفسیر فکر فراہی کی ترجمان اور ترجمۂ قرآن زبان وادب کا شہ پارہ ہے۔ فی ملکوت اللہ کا ترجمہ بھی بہتر اور اکثر جگہوں پر مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ امام فراہی کی تمام وناتمام تصانیف کے لیے دیکھیں: مفردات القرآن (محقق ورژن)، ص:۳۹-۳۲

۲۔ فی ملکوت اللہ، ص:۵

۳۔ **إمعان في أقسام القرآن، صفحه ٥ من ترجمة الفراهي**

۴۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ)، ص:۶-۵

۵۔ ان دو بزرگوں کے نام پروفیسر عبید اللہ فراہی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ہے۔

۶۔ فی ملکوت اللہ، ص:۵

۷۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ)، ص:۱۵-۱۴

۸۔ فی ملکوت اللہ، ص:۵

۹۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ)، ص:۱۴

۱۰۔ فی ملکوت اللہ، ص:۸

۱۱۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ)، ص:۱۸

۱۲۔ فی ملکوت اللہ، ص:۱۰

۱۳۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ)، ص:۲۰

۱۴۔ فی ملکوت اللہ، ص:۱۳

۱۵۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ)، ص:۲۴

۱۶۔ فی ملکوت اللہ، ص:۲۰

۱۷۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ) ص:۳۳

۱۸۔ فی ملکوت اللہ، ص:۷-۶

۱۹۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ)، ص:۱۷-۱۶

۲۰۔ دیکھیں: تدبر قرآن، ۳/۲۷۶

۲۱۔ علم کے ساتھ کا صلہ کسی چیز کو باریکی سے جاننے کو کہتے ہیں، حضرت حسّان کہتے ہیں (شرح دیوانہ، ص:۳۲۹)

فلیت خبیبًا لم تخنه أمانةٌ

ولیتَ خبیبًا کان بالقوم عالما

ترجمہ: کاش خبیب (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ (دشمنوں نے) امانت میں خیانت نہ کی ہوتی اور کاش خبیب کو دشمنوں کا بخوبی علم ہوتا۔

اسی کا مخالف جہل بہ ہے جس کا مطلب ہے نرا جاہل، حضرت حسان فرماتے ہیں (شرح دیوانہ، ص:۲۷۲):

أجئتَ محمدًا عظمًا رمیمًا

لتُکذِبَه وأنت به جَهُول

ترجمہ: کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس تم بوسیدہ ہڈی لے کر آئے تاکہ تم انھیں جھوٹا ثابت کر سکو جبکہ تم اس سے نرا جاہل ہو۔

۲۲۔ فی ملکوت اللہ، ص:۷-۶

۲۳۔ فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ) ص:۱۶

۲۴۔ ایضاً، ص:۳۳

کتابیات

۱۔ امین احسن اصلاحی، تدبّر قرآن، فاران فاؤنڈیشن [لاہور] پاکستان، نومبر ۲۰۰۹ء

۲۔ ضابط بالحربية، شرح ديوان حسان بن ثابت أنصارى، مطبعة السعادة، مصر، بدون تفصيل

۳۔ فراہی، المعلّم، عبدالحمید، إمعان فى أقسام القرآن، المطبعة السلفية و مكتبتها، قاهره، ۱۳۴۹ھ

۴۔ فراہی، حمیدالدین، فی ملکوت اللہ (اردو ترجمہ: پروفیسر الطاف احمد اعظمی)، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الإصلاح، سرائمیر، اعظم گڈھ، فروری ۲۰۱۳ء

۵۔ فراہی، عبدالحمید، فی ملکوت اللہ (عربی)، مکتبۃ الإصلاح، سرائمیر، اعظم گڈھ، ۱۳۹۱ھ

۶۔ فراہی، عبد الحمید، مفردات القرآن (تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی)، دار الغرب الإسلامی، بیروت، پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۲ء

۷۔ مولانا فراہی کے بنیادی اُفکار، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

ڈاکٹر ہیفا شاکری*

فکرِ آزاد اور حب الوطنی

مشہور قول سلف ہے: "حب الوطن من الإيمان" یعنی وطن سے محبت ایمان کا جزء ہے۔ کسی بھی قوم کے لیے اس کا وطن اولین ترجیح ہوتا ہے اور یہ بات ضروری ہے کہ وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بھرپور غور وفکر کرے تاکہ راہِ راست کا انتخاب کرکے اس پر گامزن ہو اور راستے کی طوالت کی فکر اس کو دامن گیر نہ ہو۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ سے سبھی قوموں کو گزرنا ہوتا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں ختم ہو گئیں، قدیم قوموں کی تہذیبیں مٹ گئیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دنیا کا کوئی خطہ سیدھے راستے کی طرف دعوت دینے والوں، دینِ حق کی رہنمائی کرنے والوں، پیار ومحبت، حب الوطنی، یکجہتی اور امن و سلامتی کی طرف بلانے والوں سے خالی نہیں رہا۔

یہ بات عیاں ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر ظلم و بربریت اور طاقت اختیار کرکے اپنے پنجے جمائے اور اہلِ ہند کے لیے انتہائی مشکل کھڑی کی، لیکن اہلِ وطن نے غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے اور نو دہائیوں کے بعد ذلت ورسوائی سے دامن چھڑانے کا فیصلہ کیا اور پھر وہ وقت آیا جب ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ ان سخت اور مشکل ترین حالات میں کچھ ایسے افراد کھڑے ہوئے

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ ای میل: heifa.shakri@gmail.com

جو اہل ہند کے لیے آزادی کی شمع روشن کرنے کا ذریعہ بنے اور تحریک آزادی ہند کی قیادت کر کے ان کو غلامی کی زنجیر سے آزاد کرایا۔ ان ممتاز ہستیوں میں مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا اہل ہند ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت پر بڑا احسان ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد کا نام آسمان حریت پر پوری جرأت اور فخر و وقار کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ مولانا کی شخصیت اور ان کی حب الوطنی اور قومی اتحاد کی طرف دعوت دینے والی تحریروں کے ذریعے فعال قائدانہ کردار کو بیان کرنے سے پہلے میں اس قدیم ملک ہندوستان کی مختصر تاریخ بیان کرتی ہوں۔

ہندوستان ایک عظیم ملک

ہندوستان ایک زرخیز ملک ہے جہاں عظیم تہذیبیں پروان چڑھیں اور مختلف نسلوں نے اس کی طرف ہجرت کی۔ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے سیاہ فام لوگ تھے جو جنگل میں آباد تھے۔ ان کے بعد آریائی قبائل یہاں پہنچے جنہوں نے پنجاب کی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا۔ پھر تورانی قوم یہاں آکر آباد ہوئی اور یہاں جاٹ قبائل بھی آباد رہے۔ جس طرح یہاں مختلف نسلیں اور قومیں پائی جاتی تھیں اسی طرح مختلف مذاہب اور عقائد سے وابستہ افراد بھی یہاں موجود تھے جیسے براہمن، بدھ، ہندو، مسیحی، زرتشی اور مسلمان۔ آج بھی اس ملک میں مختلف زبانیں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں دو سو سے زیادہ زبانیں اور تین سو سے زیادہ مختلف لہجے پائے جاتے ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں یونان و فارس اس کے کچھ علاقوں پر قابض ہوئے، پھر یہاں ہندو آریائی تہذیب اپنی بلندی کو پہنچی۔ اسلام کے آنے سے پہلے ہندوستان متعدد قوموں کے زیر تسلط رہا لیکن جب عرب تاجروں کی یہاں آمد ہوئی اور ہندوستانی کشتیاں مشہور ساز و سامان لے کر عرب بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوئیں تو اسلام کا سورج اس خطے پر طلوع ہوا۔[۱]

مسلمانوں نے محمد بن قاسم کی قیادت میں ۹۳ ہجری میں ولید بن عبدالملک کے عہدِ سلطنت میں اس کو فتح کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہاں عرب اسلامک سلطنت پروان چڑھی۔ مسلم حکومت میں

غیر مسلموں کو انھیں اپنے مذہبی معاملات، عبادت خانوں کی اصلاح و مرمت اور شعائر کے متعلق مکمل آزادی حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہاں بسنے والی مسلم قوم نے ملک ہندوستان کو ہی اپنا وطن سمجھا، اس کو اپنایا اور اس کے لیے جان و مال قربان کیا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں نے یہاں اسلامی علوم و فنون کا ایک عظیم سرمایہ منتقل کیا۔ طب، صنعت و حرفت سے اور فن تعمیر قابلِ ذکر ہیں۔ مغلیہ دور حکومت میں ہندوستانی قوم ترقی اور خوشحالی کے بلند درجے پر فائز ہوئی۔ ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر مذاہب کے ماننے والے باہم پیار و محبت اور اخوت و بھائی چارگی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور یہی وہ چیز تھی جس سے برطانوی حکومت خوفزدہ تھی۔ چنانچہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر و رسوخ بڑھا اور ملکی معاملات میں مداخلت ظاہر ہونے کے ساتھ ساتھ شمال و جنوب کے بہت سے علاقے اس کے زیر تسلط ہوئے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کا بگل بج گیا، جس کو رد کرنے کے لیے انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی اور غداروں کا ساتھ لیا جس کے نتیجے میں وہ کامیاب ہوئے۔ بعد ازاں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو ملک بدر کیا۔ ان کے بیٹوں اور اہل خانہ کو قتل کر کے برصغیر ہند کو برطانوی حکومت کے ماتحت ضم کرنے کا اعلان کیا۔ اگرچہ برطانوی حکومت کے قبضے کی مدت ۹۰ سال ہے لیکن انگریزوں کا تسلط اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانی ساحلوں پر پرتگالیوں، ڈچوں اور فرانسیسیوں کے اثر و رسوخ کو ختم کر کے ہندوستانی حکمرانوں اور مختلف فرقہ وارانہ حکومتوں کے مابین جھگڑے اور سازشیں بھڑکا کر اپنے لیے راہ ہموار کی لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی قوم بیدار ہوئی اور وطن کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس اس کو دامن گیر ہوا۔ ذیل میں تحریک آزادی میں مولانا آزاد کی تحریروں کی روشنی میں حب الوطنی و اتحاد و قومیت کے متعلق ان کے نظریات کا ذکر ہے۔

حالات زندگی

آپ کی پیدائش ۱۳۰۵ ہجری مطابق ۱۸۸۸ء عیسوی کو مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ آپ کے والد مولانا خیرالدین جبکہ والدہ عالیہ بنت شیخ محمد ظاہر ہیں۔[۲]

شیخ محمد ظاہر مدینہ منورہ میں مسند افتاء پر فائز تھے۔ آپ کے والد محترم نے مکہ مکرمہ ہجرت کی

اور وہاں ۲۹ سال گزار کر اپنی شریک حیات کی وفات و تدفین کے بعد واپس اپنے شہر کلکتہ تشریف لے آئے۔ آپ کے والد نے آپ کا نام فیروز بخت رکھا۔ اس کے علاوہ بھی دیگر ناموں سے جیسے غلام محی الدین آزاد یا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد کے نام سے آپ کو پکارا گیا لیکن شہرت ابوالکلام آزاد کے نام سے ملی۔ آپ جس وقت اپنے والد محترم کے ساتھ کلکتہ تشریف لائے اس وقت آپ کی عمر چھے یا سات برس تھی۔[۳]

مروجہ طریقے پر آپ کی تعلیم ہوئی۔ قرآن کریم پڑھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر جب والد بیمار ہوئے تو گھر ہی پر رہتے ہوئے مختلف علمائے کرام سے کسبِ فیض کیا۔ آپ نے کسی اسکول یا کالج میں داخلہ نہیں لیا اور نہ ہی کوئی رسمی ڈگری حاصل کی لیکن آپ کو اللہ تعالی نے اردو زبان میں وہ قوت خطابت عطا کی جس کی نظیر ہندوستان میں نہیں تھی۔ آپ انگریزی زبان کی باریکیوں سے بھی مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ فرانسیسی اور ترکی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ آسان الفاظ میں خود ساختہ انسان تھے۔ آپ کا ماننا تھا کہ باہمت لوگ خود ہی اپنی منزل تلاش کرتے ہیں اور اپنی عزت ومقام کو اپنی محنت اور بنائے ہوئے ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔[۴]

فکر آزاد اور حب الوطنی

دسمبر ۱۹۱۲ء کے **الہلال** میں مولانا نے لکھا کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا حب الوطنی ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ایک دینی فریضہ ہے۔ اس طرح مولانا آزاد نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ حب الوطنی اساسیت دین میں شامل ہے۔ اور انگریزوں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا قومی فریضہ کے ساتھ ساتھ دینی فریضہ بھی ہے۔

۱۹۹۸ء میں آپ نے مختلف ممالک کا دورہ کیا، جس میں مشرقِ وسطی، ترکی اور یورپی ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک میں آپ نے مذہبی اور قومی تحریکوں سے واقفیت حاصل کی اور ان کے قائدین سے باضابطہ ملاقات کی۔ جامعہ ازہر کی زیارت کی اور وہاں لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے نظریات سے متاثر ہوئے۔ ترکی میں ترک جماعت کے رہنماؤں سے ملاقات کی۔ اسی طرح عراق میں استعمار مخالف قائدین سے ملاقات کی۔ ان لوگوں سے ملاقات اور گفتگو کے بعد آپ کو

اس بات کا ادراک ہو گیا کہ مسلمانانِ ہند کے لیے اپنے ملک کی سیاست میں حصہ لینا ناگزیر ہے بلکہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزادیِ ہند کی تحریک میں ایک مضبوط سہارا بنیں۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے الھلال نامی اخبار کو ایک مؤثر ذریعہ بنایا۔ اس سے پہلے وہ مجلّہ: لسان الصدق بھی جاری کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ نیرنگ عالم، المصباح اور دوسرے بعض ایسے رسائل و اخبارات بھی جاری کیے جن کی نگرانی اور ادارت آپ کے ذمہ تھی، جیسے: پیغام، الجامع اور الوکیل۔ ایڈورٹ گزٹ میں بھی آپ بحیثیت مدیر کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار: الندوہ میں بھی آپ نے تحریری تعاون پیش کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا نے ہمیشہ یہ خواہش کی کہ پوری ہندوستانی قوم بشمول مسلمان آزادیِ ہند میں شامل ہو۔

مولانا سیاسی میدان میں آنے کے بعد کئی عہدوں پر فائز رہے۔ وہ چھ سال تک کانگریس پارٹی کے صدر رہے۔ حالانکہ کانگریس کے حامیوں نے نشاندہی کی کہ ان کا انتخاب کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ ۱۸۸۵ء میں پارٹی کے قیام کے بعد سے چھے سے زیادہ مسلمان ان سے پہلے اس عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔[۵] آپ ۱۹۵۲ء میں تعلیم، قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیق کے وزیر منتخب ہوئے۔ اس منصب پر آپ تاعمر فائز رہے اور آپ کی وفات ۲۲ رفروری ۱۹۵۸ء کو ۶۹ سال اور چھے ماہ کی عمر میں ہوئی۔

مولانا آزاد نے برطانوی حکومت کے ہاتھوں بہت زیادہ ظلم و ستم برداشت کیے کیونکہ انھوں نے قومی آزادی کی جدو جہد میں فعال کردار ادا کیا، استعمار مخالف سرگرمیوں میں پیش پیش رہے اور برطانوی حکومت سے ہندوستانی عوام کو حق خود ارادیت دلانے کے لیے بار بار آواز اٹھائی۔ چنانچہ جلاوطنی، قید اور نظر بندی جیسی سزائیں حصے میں آئیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ بہت سے لوگوں نے ان کی سیاسی ذہانت اور اس میدان میں وسیع تجربے کا اعتراف کیا۔ جواہر لال نہرو کہتے ہیں:

> ''ابوالکلام آزاد نے براہِ راست قوم پرستوں پر حملہ نہیں کیا پھر بھی اس نوجوان مصنف اور صحافی کا تعلیم یافتہ مسلم حلقوں پر گہرا اثر تھا۔ اگرچہ انکا اندازِ فکر کچھ بڑے لوگوں کو پسند نہیں تھا لیکن ان کے الفاظ نے ابھرتی ہوئی نسل کے ذہنوں میں ایک بیج بو دیا اور وہ ہندوستانی قومی تحریک کی ترقی کے

باعث پروان چڑھے۔مولانا نے اس تحریک کوحتمی سمت اس وقت دی جب انھوں نے بتایا کہ اسلام اور مسلم ممالک کے لیے ہمدردی اور ہندوستانی قوم پرستی اوران کی حب وطن میں کوئی تضاد نہیں ہے۔''[۶]

نہرو نے یہ بھی تسلیم کیا کہ آزاد ایک دوراندیش اور گہری حساسیت رکھنے والے انسان تھے اور وہ کانگریس کے ایک ہوشیار اور قابل منتظم تھے،جن کا سبھی احترام کرتے تھے۔

آزاد اور قومی اتحاد

مولانا کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ وہ اپنے وطن اور قوم کی خدمت کریں اور لوگوں کو اتحاد کی دعوت دیگر ان اختلافات کی بیخ کنی کریں جنھیں وہ ہندوستانی قوم کو تباہ کرنے کا باعث خیال کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں فصیح اور پرکشش انداز اختیار کیا ہے، یہ فصاحت ان کی یادداشتوں،خطوط، یا تقریروں میں یکساں دیکھی جاسکتی ہے۔اپنی عمدہ ذہانت وبصیرت اور اپنی ذہنی طاقت کے ساتھ انھوں نے ہندوؤں کو یہ باور کرانا شروع کیا کہ مسلمان سیاسی آزادی کے خلاف اور نہ ہی ہندو برادری کے خلاف ہیں۔وہ کہتے ہیں:

> ''میں نے ان کو سمجھایا کہ مسلمانوں کے خلاف مخالفانہ رویہ اختیار کرنا یا کم از کم ان سے بے اعتنائی برتنا، سیاسی آزادی کی جدوجہد کو مزید مشکل بنا دے گا،اس لیے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان اعتماد پیدا کرنے کے لیے مخلصانہ کوششیں کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ آپس میں دوستی کریں تاکہ آزادی کے حصول میں معاون ثابت ہوں۔''[۷]

یہ بات واضح تھی کہ ہندوستان کی آزادی تمام مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان اتحاد کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے،اس لیے سبھی قومیں ساتھ چلیں کیونکہ آزادی سبھی کی ضرورت تھی۔ان کا خیال تھا کہ لوگوں کہ یہ سمجھنا ہوگا کہ آزادی سونے کی طشتری میں نہیں پیش کی جائے گی بلکہ اسے انگریزوں کے چنگل سے چھینا ہوگا۔جب آزاد نے سیاسی میدان میں قدم رکھا تو انھوں نے محسوس کیا کہ برطانوی حکومت ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہے کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو

تقسیم ہوئی تھی اس نے ان دونوں کو نقصان پہنچایا تھا، اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جتنی زیادہ پھوٹ پڑی، استعماریت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی ہندوستان پر گرفت مضبوط ہوگئی۔

تحریک آزادی کے زیادہ تر قائدین خصوصا مولانا ابوالکلام آزاد نے قومی اتحاد کی وکالت کی۔ وہ تحریک آزادی کے معمار تھے، اس کے منصوبے مرتب کرتے تھے، اور لوگوں کو تحریک سے جوڑتے تھے۔

قومی یکجہتی کے حوالے سے فرمایا کرتے تھے میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہوسکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تھی جنھوں نے اسلام قبول نہ کرنے والوں سے معاہدہ کیا اور لکھا:

> ہم ایک قوم ہیں۔ ہم مدینہ کے مضافات میں رہنے والے تمام قبائل کے ساتھ صلح کرتے ہیں۔ ہم ان سے متفق ہیں، اور ہم ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔''[۸]

آزاد نے مدینہ کے میثاق کا حوالہ دیا اور اس سے ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان قومی اتحاد کے اصولوں کو اخذ کیا۔ یہاں لفظ ''قوم'' انگریزی لفظ "nation" کا مترادف ہے۔ آزاد جانتے تھے کہ مایوسی کو دور کرنا اور قوم کے ارکان میں اعتماد کو مضبوط کرنا صرف ایک متحد اور طاقتور سیاسی برادری کی تشکیل سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مولانا آزاد نے جو نظریہ اپنایا تھا وہ نہ صرف ہندوستانی عوام بلکہ سیاستدانوں کے لیے بھی فائدہ مند تھا۔ جب کانگریس پارٹی میں پھوٹ پڑی اور اس کے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہوا تو ۱۹۲۳ء میں دہلی میں ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا جس کی صدارت مولانا نے کم عمری میں کی۔ انھوں نے اپنی سیاسی ذہانت کی بدولت اس مسئلے کا ایک مناسب حل تلاش کیا اور پارٹی کو اس عظیم بحران سے نکال لیا۔ انھوں نے اعلان کیا:

> ''میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے نہ مسلم سنگھٹن کی، ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ یہ انڈین نیشنل کانگریس ہے۔''[۹]

مولانا کے لیے حالات انتہائی مشکل تھے۔ یہاں تک کہ تجربہ کار لیڈر بھی لڑکھڑا گئے اور وہ حالات کے بہاؤ میں بہہ گئے لیکن مولانا آخری دم تک ثابت قدم رہے۔ انھوں نے اپنے ملک کے لیے اپنی مذہبی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس طوفان کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے کہا، " آزادی کا چراغ ایسا چراغ ہے جو کبھی نہیں بجھتا۔ مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں، اور ہندوستان کی خدمت کرنا ان کی دینی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ انسانیت، سچائی اور انصاف کی حمایت کرتے ہیں، ان کے درمیان تفریق کرنا ناانصافی ہے۔ دنیا کی خدمت مسلمانوں کا نصب العین ہے۔ وہ انسانیت کے خادم ہیں اور خدا کی زمین کا ہر حصہ اور اس کے بندوں کا ہر گروہ ان کے نزدیک قابلِ احترام ہے۔[۱۰]

مولانا نے محسوس کیا کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت حساس ہے اور ان کے درمیان اعتماد شکوک وشبہات کے ازالہ سے ہی ممکن ہے۔ انھوں نے کہا:

> ''میں آپ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی تعلقات کی اصل شکل دکھانا چاہتا ہوں۔ اگر مسلمانوں نے آپ کی طرف محبت، اتحاد اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو یہ کوئی عارضی، دفاعی یا سیاسی چال نہیں ہے بلکہ مسلمانوں نے خدا کے حکم اور شریعت کے قوانین کی پیروی کرتے ہوئے آپ کو اپنے سینے سے لگایا ہے کیونکہ ہماری بنیاد شریعت ہے اور میرا موقف آج بھی وہی ہے جو آج سے بیس سال پہلے تھا۔''[۱۱]

مولانا نے شریعت کو اپنے موقف کی بنیاد بناتے ہوئے حب الوطنی اور قومی اتحاد کو خالق کی طرف سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے تحفہ سمجھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ مشترکہ کوششیں اسلام کی اصل روح ہیں اور مسلمانوں کو آگے بڑھنا چاہیے اور مال وجان کی قربانی دینی چاہیے۔[۱۲]

مولانا نے اپنی تعلیمات اور رہنمائی کے ذریعے آزادی اور سب کے لیے روشن مستقبل کا راستہ ہموار کیا۔ یہ بات ان کے مشہور اختتامی کلمات میں واضح نظر آتی ہے جو انھوں نے ۱۹۴۰ء میں کانگریس پارٹی کے اجلاس میں کہی تھی:

> ''آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے: اتحاد، ڈسپلن

اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔'' [۱۳]

ہندوستان کے مختلف مذاہب

مولانا آزاد ہندوستان کے متنوع مذاہب، فرقوں اور عقائد سے واقف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مذہب انسان کو اللہ سے اور حقوق العباد کے ذریعہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے مربوط رکھنے کا وسیلہ ہے۔ وطن سے محبت اس کی ایک اہم کڑی ہے۔ انھوں نے سیکولرزم کی وکالت کی، لیکن مغربی سیکولرزم کی نہیں، جس کا مقصد مذاہب کی نفی کرنا ہے۔ بلکہ انھوں نے ایک ایسے سیکولرزم کی وکالت کی جو سیاسی اور سماجی شعبوں میں انسانی حقوق کی محافظ ہو اور ہر فرد کو دوسرے کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے اپنے مذہب کے انتخاب کی آزادی دیتا ہو۔ بحیثیت مسلمان انھوں نے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو مسلمانوں سے متعلق گردش کر رہی تھیں۔

انھوں نے ہندوؤں کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا بھی ازالہ کیا۔ وہ اس بات سے پریشان تھے کہ ہندوؤں کے مذہبی اور فقہی مقام کے بارے میں غلط فہمیاں عام کی جا رہی ہیں۔ یہ بات عام لوگوں کے تعلقات کو متاثر کرتی ہے۔ یہ آواز انھوں نے ۱۹۶۵ء میں المعارف میگزین کے متعدد مضامین میں اٹھائی تھی۔ انھوں نے یہ تاثر بھی دیا کہ عرب فاتحین اور ان کے ساتھ آنے والے علماء ہندوؤں کو اہل کتاب کی طرح سمجھتے تھے اور انھوں نے ان کے ساتھ اپنے سماجی تعلقات میں ان کی مذہبی آزادی اور رواداری کو تسلیم کیا تھا۔ البتہ قربانی اور شادی کے معاملات میں انھیں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ شامل نہیں کیا تھا۔ [۱۴]

مولانا نے قوم پرستی کی بنیاد اس سیکولزم پر رکھی جس کے وسیع تر معنوں پر وہ یقین رکھتے تھے اور انھوں نے حکم دیا کہ ہم اس کے اصولوں کو اپنی زندگی کا فلسفہ بنائیں۔ وطن سے محبت اور قومی اتحاد کے لیے تدبر، وسیع نظری اور دوسرے کے عقائد کے احترام کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان کی زندگی کے تجربات نے ان میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ اسلام اس

سے منع نہیں کرتا اور انھیں ہندوستانی ہونے اور ایک ناقابلِ تقسیم قوم کا حصہ ہونے پر بے حد فخر تھا جو مشترکہ ہندوستانی ثقافت کے ستونوں پر قائم ہے۔ انھوں نے یہ بات ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ میں کانگریس پارٹی کی میٹنگ میں کہی۔ انھوں نے سمجھایا کہ متحدہ ثقافت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی تبادلے کا نتیجہ ہے۔ اس تبادلے نے ہندوستان کو گیارہ سو سالوں سے مشترکہ ثقافتی ورثے سے مالا مال کیا ہے۔ ہماری زبان، ہمارا ادب، ہمارے فنون، ہمارے لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری یادیں، سب پر ہماری مشترکہ کوششوں کی مہر ثبت ہے۔ ایک ہزار سال پہلے رائج طرز زندگی کو زندہ کرنے کے خواہشمند لوگ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور اگر مسلمان ایران اور وسطی ایشیا سے لائی گئی تہذیب کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ خیال بھی کامیاب نہیں ہوگا۔[۱۵]

مولانا نے واضح طور پر وطن سے محبت اور قومی اتحاد کی حقیقی خصوصیات کا خاکہ پیش کیا۔ وہ ایک مسلمان اور ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے اسلام کے نظریات ورثے میں ملے ہیں۔ میں اس کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اسلام کی تعلیمات، تاریخ، علوم اور تہذیب میرا ورثہ ہیں اور ان کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ بحیثیت مسلمان میری مذہبی اور ثقافتی حلقوں میں ایک الگ پہچان ہے اور میں اس میں کسی قسم کی مداخلت و مدانیت برداشت نہیں کروں گا۔ تاہم ان احساسات کے علاوہ، ایک اور جذبہ بھی ہے جس سے اسلام منع نہیں کرتا بلکہ میری رہنمائی کرتا ہے جس سے مجھے ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ میں ایک متحد ہندوستانی قوم کا ایک لازمی عنصر ہوں، جسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور جس کی عظمت میرے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور میں اس کے وجود کا ایک اہم عنصر ہوں، اور میں اس دعوے سے دستبردار نہیں ہوں گا۔

اس طرح آزاد نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو متحد ہونے، اپنے وطن کی لیے قربانیاں دینے اور برطانوی استعمار کے خلاف ایک ساتھ کھڑے ہونے کی اپیل کی کیونکہ یہ واحد راستہ تھا جو انھیں آزادی دلا سکتا تھا۔

ملک کی تقسیم اور مولانا کا موقف

مولانا نے مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کی دو ریاستوں میں تقسیم کو مسلم لیگ کے قائدین کی

طرف سے سرزد ہونے والی ایک سنگین غلطی سمجھا جن میں محمد علی جناح سر فہرست تھے۔ انھوں نے تقسیم کو ہندوستان میں قومی اتحاد کے خلاف ایک تباہ کن قوت کے طور پر دیکھا اور انھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو اس سے آگاہ کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو تقسیم کی وکالت کرنے والوں کے دعووں پر یقین کرنے کے خلاف خبردار کیا کیونکہ ان کی بصیرت انگیز نظر نے مستقبل کا پردہ چاک کر دیا تھا اور ان کی گہری نظر ان تمام مسائل کو دیکھ رہی تھی جن کا ریاست پاکستان کو سامنا کرنا تھا۔ مولانا نے انھیں بتایا کہ ایسی ریاست کا قیام مسلمانوں کے لیے خاص طور پر نقصان دہ ہوگا کیونکہ اس کے بننے کے بعد بھی بہت سے مسلمان ہندوستان میں ہی رہیں گے اور آپس میں چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹ جائیں گے اور کمزور پڑ جائیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں کو ایک دن یہ احساس ہوگا کہ وہ اپنی سرزمین پر اجنبی بن چکے ہیں اور صنعتی، سائنسی اور اقتصادی ترقی میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ [۱۶]

وہ ہر موقع کو غنیمت جان کر اتحاد و اتفاق کی طرف لوگوں کو بلاتے اور انھیں ایک ہی خاندان کے افراد تصور کرتے تھے۔ انھیں حب الوطنی کا درس دیتے اور فرقہ واریت کو دنیا کی سب سے گھناؤنی برائیوں کے طور پر دیکھتے تھے۔ ۱۳؍ اپریل ۱۹۳۹ء کو جلیانوالہ باغ کی یاد میں ان کی تقریر میں یہ بات واضح تھی۔

یہ وہ سرزمین ہے جہاں موت کی خاموشی نے قومی یکجہتی کی یکجہتی کی عالمگیر آواز کو جگایا۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا خون ایک ساتھ بہتا ہے۔ ہم نے اس موت کے خون سے اپنی زندگیوں کے لیے رزق نکالا ہے۔ اور آج میں ہر ہندو، مسلمان اور سکھ سے بھی کہتا ہوں کہ وہ دل کی گہرائیوں سے اس واقعہ پر غور کریں اور سوچیں کہ کیا اس کا اثر ہمارے ذہنوں اور دلوں پر باقی ہے یا ختم ہو گیا ہے؟ [۱۷] لیکن مولانا اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے قیام پاکستان کے تصور کی تمام تر مخالفت کے باوجود وہی ہوا جس کا ان کو خدشہ تھا اور ریاست پاکستان ہندوستان کے آزادی حاصل کرنے سے صرف ایک دن پہلے دونوں طرف کے مظلوموں کی باقیات اور لاشوں پر نمودار ہوا اور مولانا دکھ اور ندامت کے جذبات سے لبریز ہو گئے۔ انھوں نے کہا:

> ''ایک وقت وہ آتا ہے جب حالات لیڈر کے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔
> اور یہی کچھ تقسیم سے پہلے ہوا تھا۔ اس وقت یہ معاملہ ہی نہیں تھا کہ کون تقسیم

چاہتا ہے اور کون نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان حالات میں اور لہروں میں ہمارا ملک بھی بہہ گیا، پنڈت جی اور گاندھی جی بہ گئے، اور جناح بھی بہہ گئے۔''[۱۸]

مسلمان ہجرت کی آڑ میں پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے اور اس کے برعکس شمالی علاقوں سے ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے ہندوستان آئے۔ فرقہ وارانہ تشدد اور دونوں طرف سے بزرگوں، عورتوں اور بچوں کے قتل کی خبریں عام ہوگئیں۔ ان واقعات نے مولانا آزاد پر گہرا اثر ڈالا جیسا کہ ۱۲؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی کے ۸۸ویں یوم پیدائش کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ نشر کی گئی ان کی تقریر میں اس کا ثبوت ہے: مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے لیے امن نہیں ہے اور نہ ہی ریاست کے مغربی حصے میں ہندوؤں اور سکھوں کے لیے کوئی تحفظ ہے۔ اور یہ دہلی جہاں سے میں آپ کو مخاطب کر رہا ہوں، یہاں جو کچھ ہوا، اس نے ہر محبّ وطن ہندوستانی کا دل توڑ دیا۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں اچانک کیا ہوگیا ہے؟ اور ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کل ہم نے ملک کی آزادی کا انتظار کیا اور بہت سے منصوبے بنائے اس ایک آزاد ہندوستان کے لیے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے کے لیے اپنی پوری کوشش کرنے میں مدد کریں[۱۹] حکومت کی شعلوں کو بجھائیں مولانا نے تقسیم ہند کو ایک دردناک واقعہ سمجھا اور تقسیم کے نتائج سے لوگوں کو بچانے کی پوری کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں بھولے کہ لوگ ایک ہیں اور ان کی ثقافتی زندگی ایک ہے۔ انھوں نے اس کی مثال پانی میں چھڑی رکھنے کی مثال سے بیان کی، جہاں پانی تقسیم نظر تو آتا ہے، ہم آہنگ رہتا ہے اور جیسے ہی چھڑی ہٹ جاتی ہے، ظاہری تقسیم بھی ختم ہو جاتی ہے۔[۲۰]

انھوں نے مختلف مذاہب کے درمیان محبت کے بندھن کو مضبوط کرنے کی کوشش کی اور اس وطن کی محبت، یکجہتی، رواداری اور افہام و تفہیم پر زور دیا تاکہ ہندوستانی قوم اعتماد کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

مولانا مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اعتماد قائم کرنے کے اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اپنے تمام مفادات کو قربان کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے جیسا کہ انھوں نے کہا: ''مقصد تک پہنچنے کی مٹھاس وہی جانتا ہے جس نے محرومی کا مزہ چکھا ہو۔''[۲۱]

انھوں نے لوگوں کے سامنے یہ واضح کیا کہ ہندوستان ایک ایسی جگہ ہے جس کے دامن میں متعدد انسانی نسلوں نے پناہ لی اور اور مختلف تہذیبیں اور مذاہب پروان چڑھے اور اس کی شفقت بھری آغوش میں ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ ان قافلوں میں سے آخری مسلمانوں کا کارواں تھا اور ہم زبان، ادب، شاعری اور فنون پر ثقافتی تبادلے کے نقوش محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم ہندو اور مسلمان، قوم پرستی کے عناصر ہیں جنھیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔[۲۲]

مولانا نے اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں کو ان کی نام نہاد ہجرت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ان میں حب الوطنی اور اتحاد کے لیے قدر دانی پیدا کرنا چاہتے تھے جو قدیم زمانے سے ہندوستانی لوگوں کی خصوصیت رہی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت دالو، اور بہر حال دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کر رہے ہیں، کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیے ہیں؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا، اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔[۲۳]

مذہب میں حب الوطنی کا تصور

سیاست کے ہنگاموں اور اتھل پتھل سے دور مولانا نے ایسی رائے رکھی جو ان کے درست فیصلے اور گہری بصیرت کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس قیمتی وطن کے لوگوں میں قومی یکجہتی اور رواداری کے اپنے مقصد کے لیے ان کی اٹوٹ وابستگی ثابت قدم رہی۔ یہ ان کی غیر سیاسی تحریروں اور تقاریر سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ ان کی تحریر ''سورہ الفاتحہ کی تعلیمی روح'' میں مولانا نے وضاحت کی کہ الفاتحہ ایک دعا ہے اور جو شخص اس کو دن رات باقاعدگی سے پڑھتا ہے، وہ ممکنہ طور پر اصل، نسل یا ملک میں فرق کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور ایسے شخص کی یہ شان نہیں ہے کہ ایک فرقے پر دوسرے فرقے کی طرف داری کرے کیونکہ وہ محرومی اور گمراہی سے پناہ مانگتا ہے اور اپنے اور سب کے لیے ہدایت اور صراط مستقیم کا طالب ہے۔ ایسا شخص اس طرح پرورش پاتا ہے کہ اس کا دماغ خدا کی رحمت اور خوبصورتی سے معمور ہوتا ہے اور وہ فرقہ پرست نہیں ہوتا۔ یہ قرآنی پیغام کی روح ہے۔ انسانی تعامل کے بارے میں

قرآن واضح کرتا ہے کہ اس معاملے کی بنیاد محبت، ہمدردی، رحم، حسن سلوک اور تعاون ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سچائی کے سب سے زیادہ بولنے والے تھے: ''اے خدا گواہ رہنا کہ تمام لوگ بھائی بھائی ہیں۔'' (ابوداؤد و مسلم) [۲۴] مولانا کی نظر میں، قرآن پاک دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور رواداری اور ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

> ''قرآن نے عقیدہ کے معاملہ میں کسی بھی قسم کے خودغرضانہ موقف کو جائز نہیں ٹھہرایا ہے، خصوصا جب معاملہ ذات الٰہی سے متعلق ہو۔ وہ توحید اور تنزیہ کو تمام شکوک وشبہات سے بالاتر ہونے کی حفاظت کرتا ہے لیکن یہ ہمیں کسی بھی طرح سے دوسروں کے لیے رواداری سے نہیں روکتا۔'' [۲۵]

ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ محبت اور حب الوطنی کا پیغام

مولانا چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کی ہندوستانیت اور اپنی وطن سے محبت دنیا کے لیے ایک مثال ہو. مولانا نہ صرف اپنے وطن میں اتحاد کے خیال کے قائل تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ دنیا بھر میں اتحاد عام ہو جائے اور ہندوستان وہ باعث فخر اور روشن منارہ بنے جو سیاسی اور ثقافتی یکجہتی کے نظریات کو پھیلاتا ہو۔ اس لیے انھوں نے ایشیائی تعلقات کانفرنس کے اجلاس کو ایک پلیٹ فارم کے طور پر لیا جہاں سے انھوں نے باہمی افہام وتفہیم اور دوستی کی دعوت کا آغاز کیا۔ انھوں نے اس پختہ یقین کے ساتھ شریک ممالک کا شکریہ ادا کیا کہ جب مشترکہ وفود اپنے وطن واپس جائینگے، تو وہ اپنے ساتھ ہندوستان دوستی اور محبت کے جذبات لے کر جائیں گے۔ [۲۶]

مزید برآں وہ اپنی عظیم قوم کو دنیا کے سامنے ایک روشن اور دل کش نور میں پیش کرنے کے خواہاں تھے جس سے لوگوں کی یکجہتی اور اتحاد و محبت کی عکاسی ہوتی ہے۔ ۱۴/فروری ۱۹۵۸ء کو انڈین کونسل برائے ثقافتی تعلقات کے قیام کے موقع پر ایک تقریر میں انھوں نے بتایا کہ پاکستان نے دنیا کے سامنے تقسیم کے دوران پناہ گزینوں اور قاتلوں کے مسئلہ کا صرف ایک رخ پیش کیا اور ہندوستان کے خلاف ایک پروپیگنڈا مہم شروع کی کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے لیکن مجھے یہ خبر دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ انڈین کونسل برائے ثقافتی تعلقات کے محض قیام سے تصویر تبدیل ہوگئی۔ دنیا کو

یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ ایک پروپیگنڈہ ہے جس کا مقصد ہندوستان کی شبیہ خراب کرنا ہے اور یہ بے بنیاد جھوٹ پر مبنی ہے اور دنیا کو یہ بات سمجھ آ گئی کہ حکومت کوئی ہندو حکومت نہیں ہے، بلکہ ایک سیکولر قومی حکومت ہے جس میں تمام ہندوستانی شامل ہیں۔ [۲۷]

مولانا کے کھلے ذہن اور درست فیصلے نے انھیں ایسے معاملات کے بارے میں بات کرنے کے قابل بنایا جس کے بارے میں ان جیسے آدمی نے شاذ و نادر ہی بات کی ہے۔ تاہم انکی وسعت فکر اور رواداری ہی وہ ذریعہ تھی جو انکی تحریروں اور تقاریروں کو قوت بخشتی تھی۔ یہ اس وقت واضح ہوا جب انھوں نے موسیقی اور تھیٹر اکیڈمی کا افتتاح کیا اور کہا: ''ہندوستانی ثقافت کا جوہر یہ ہے کہ یہ مختلف ثقافتوں کے عناصر کو جذب کر لیتا ہے اور خود یہ عناصر اس کی ثقافت میں اور گھل مل جاتی ہے اور یہ موسیقی کے میدان سے زیادہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا ہے۔'' [۲۸]

بعض لوگ یہ گمان کر سکتے ہیں کہ امام ہند ایک مسلمان تھے، اس لیے وہ اپنی بعض رائے میں مسلمانوں کے ساتھ متعصب تھے لیکن یہ ایک سنگین غلطی ہے جس سے ہمیں بچنا چاہیے کیونکہ وہ قول اور اصول کے آدمی تھے۔ اس کا بہترین ثبوت ان کی آخری تقریر ہے جو انھوں نے انجمن ترقی اردو، ہند کے ۱۵ اور ۱۷ فروری ۱۹۵۸ء کے درمیان منعقدہ ایک اجلاس میں کی تھی۔ انھوں نے کہا: ''مجھے یاد ہے کہ چالیس سال پہلے ہندوستان کی سرکاری زبان کونسی ہونی چاہیے اس پر بحث ہوئی تھی: ہندی یا اردو؟ ہر طرف سے فیصلہ کیا گیا کہ اس کی زبان کو ترجیح دی جائے۔ ہندی کو ملک کی سرکاری زبان بنایا گیا تھا۔ اب آئین اور قانون کا احترام کرنے والے ہر شہری کو اس کی پابندی کرنی چاہیے اور اس کے خلاف کام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مولانا کی آخری تقریر تھی اور اس کے ایک ہفتے بعد آپ انتقال کر گئے۔ محمود رامپوری نے کیا ہی خوب کہا ہے:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

درحقیقت ہم اس عظیم ہستی کے احسانات کو یاد رکھتے ہیں جس کے روشن خیالات، تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات سے ہم نے استفادہ کیا ہے۔ وہ تو ایسے شخص تھے جنھوں نے عالمی امن اور انسانی بھائی چارے کی دعوت دینے اور مذہبی اور فرقہ وارانہ تنازعات سے دور رہنے، اپنے وطن سے سچی

محبت کرنے اور اس کے لیے قربان ہو جانے کی اپیل کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ وہ ایک ایسے رہنما تھے جنھوں نے ہندوستانی عوام کی آزادی اور آزادی کے افق کی طرف رہنمائی کی۔ اپنی غیر معمولی بصیرت کے ساتھ، وہ تنوع کے پیچھے چھپی ہوئی وحدت کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے اور وہ جدید ہندوستانی تاریخ کے اسٹیج پر ایک ایسے شخص اور مفکر کے طور پر ابھرے جس کا ہر کوئی احترام کرتا ہے۔

انھوں نے ہندوستانی عوام کے لیے عظمت اور اس کے حصول کی راہ ہموار کی جوان کو ان کے مقصد کی طرف لے جائے۔ وہ ہندوستان کو ایک ایسا باغ سمجھتے تھے جس میں ایک ہزار گلاب کھلے ہوں اور ہر ایک کا اپنا الگ رنگ اور خوشبو ہو، پھر بھی یہ سب اس باغ کی زینت ہوں، اس سے محبت کرتی ہو۔ ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم ان کے اصولوں کو اپنے لیے مشعل راہ، ان کے الفاظ کو اپنی روشنی، ان کے تاثرات کو اپنے لیے راہنما اور ان کی تحریروں کو ایسی مثال کے طور پر اختیار کریں جس سے پورا ملک فیضیاب ہو، چاہے اس عمل میں ہمیں انفرادی نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

کتنے آدمی سالوں زندہ رہتے ہوئے بھی اپنے وطن اور عوام کے لیے وہ نہیں کر پاتے جو مولانا نے اپنی انتھک محنت اور جدوجہد سے کیا۔ حکمت کی ایک گھڑی بھی ایسے بے مقصد پورے عہد پر سبقت لے جاتی ہے جو عظمت سے خالی ہو اور مولانا کی زندگی کے وہ لمحات بے شمار ہیں، جو انھوں نے اپنی قوم اور لوگوں کے درجات کو بلند کرنے اور انہیں متحد اور مضبوط زندگی کی طرف بلانے کے لیے وقف کیے۔ انھیں اس پیارے وطن سے محبت کرنا سکھایا، ان کے الفاظ آنے والی نسلوں کے لیے محرک اور مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ ان کی تقریریں، ان کے خطبات، رہنمائیاں، افکار و استدلال اتنا مؤثر ہیں کہ یہ جن کی روشنی میں وطن ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا۔[۲۹]

حواشی

۱۔ تاریخ المسلمين فى شبه القارة الهندية، مکتبۃ الآداب، القاہرہ (مصر) ص:۴۴

۲۔ یہ بات مختلف فیہ ہے، رجوع کریں، ہماری آزادی، اور پتلون مین، ص:۲۰، مذکور صفحہ پر یہ بات ذکر کی گی ہے کہ آپ کی والدہ شیخ محمد طاہر وتری کی بھانجی ہیں۔

۳۔ یہ بات مختلف فیہ ہے کتاب ہماری آزادی، ص:۲ پر یہ مذکور ہے کہ آپ کلکتہ ۱۸۹۰ء میں دو سال کی عمر میں تشریف

لائے۔
رسالہ جامعہ،شمارہ ماہ دسمبر ۱۹۹۹ء ص:۱۰ پرشائع شورش کاشمیری کے مقالہ میں یہ بات مذکور ہے کہ آپ ۶ یا ۷ سال کی عمر میں کلکتہ منتقل ہو گئے تھے۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والی کتاب مولانا ابو الکلام آزاد شخصیت، سیاست، پیغام میں ص:۱۴۹، پر یہ مذکور ہے کہ مولانا ۱۸۹۷ میں کلکتہ آئے جبکہ ان کی عمر 9 برس کی تھی۔

۴۔ تذکرہ، تحقیق، مالک رام، ساہتیہ اکیڈمی دہلی، ص:۳۷

5. The Shaping of Modern Inida, Allied publisher, Danial Thome Page 86, 1980

۶۔ **من السجن للرياسة، دار العلوم للملايين**، بیروت،۱۹۵۹ء،ص:۲۴۲

۷۔ India wins freedom, p-8

۸۔ خطباتِ آزاد،تحقیق مالک رام، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ص:۵۱

۹۔ خطباتِ آزاد،ص:۲۰۷،۲۰۸

۱۰۔ مولانا آزاد شخصیت اورکارنامے،ص:۲۶

۱۱۔ خطباتِ آزاد،ص:۵۳،۵۴

۱۲۔ India wins freedom p.7

۱۳۔ خطباتِ آزاد،ص:۳۰۰

۱۴۔ رسالہ جامعہ،دسمبر،۱۹۹۹ء،ص:۱۷۴

۱۵۔ خطباتِ آزاد،ص:۲۹۹

۱۶۔ امام ہند مولانا ابوالکلام آزاد، **المجلس الهندی للعلاقات الثقافية، دلهی** ۳۶۷/۴

۱۷۔ امام ہند مولانا ابوالکلام آزاد، **المجلس الهندی للعلاقات الثقافية، دلهی** ۱۷/۱۶/اپریل ۱۹۴۶ء، ص:۳۵۷

۱۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے،ص:۱۷۶-۱۷۷

۱۹۔ India's Maulana Abul Kalam Azad, P.166

۲۰۔ India wins freedom p.27

۲۱۔ غبارِ خاطر، آزاد ہند پبلشر،ص:۴۷

۲۲۔ خطباتِ آزاد،ص:۲۹۸

۲۳۔ خطباتِ آزاد،ص:۲۴۰

۲۴۔ ترجمان القرآن،تحقیق مالک رام، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۰ء، ۲/۴۹

۲۵۔ ترجمان القرآن،تحقیق مالک رام، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۸۰، ۲/۴۹،ص ۱۴۰

۲۶۔ India's Maulana Abul Kalam Azad, P2/213

۲۷ ۲۸/جنوری ۱۹۵۲ء کو مولانا نے یہ خطبہ پیش کیا اور یہ بات امام ہند مولانا ابوالکلام آزاد،ص:۲۷۹ سے منقول ہے۔

۲۸۔ ۱۵/فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا نے یہ خطبہ پیش کیا اور یہ بات امام ہند مولانا ابوالکلام آزاد،ص:۱۳۰-۱۳۱ سے منقول ہے۔

۲۹۔ القرآن الکریم،سورۃ آلِ عمران،الآیۃ:۱۳۹

مصادر و مراجع

۱۔ **تاریخ المسلمین فی شبه القارة الهندیة، مکتبة الأداب، ا لقاهرة، مصر**

۲۔ تذکرہ،تحقیق،مالک رام،ساہتیہ اکادمی،دہلی

۳۔ **من السجن للریاسة، دار العلوم للملایین،** بیروت ۱۹۵۹ء

۴۔ خطبات آزاد،تحقیق مالک رام،ساہتیہ اکادمی،دہلی

۵۔ خطباتِ آزاد

۶۔ مولانا آزاد شخصیت اور کارنامے

۷۔ الہلال،عدد:۹،ستمبر ۱۹۱۲ء

۸۔ رسالہ جامعہ،دسمبر ۱۹۹۹ء

۹۔ امام ہند مولانا ابوالکلام آزاد، **المجلس الهندی للعلاقات الثقافیه، دهلی.**

۱۰۔ غبارِ خاطر،آزاد ہند پبلشر

۱۱۔ ترجمان القرآن،تحقیق مالک رام،ساہتیہ اکادمی،دہلی،۱۹۸۰ء

12. The Shaping of Modern Inida, Allied publisher, Danial thome Page 86, 1980

13. India wins freedom

14. India's Maulana Abul Kalam Azad

ڈاکٹر ریحان اختر *

اجتہاد کا تصور اور اس کے اطلاق و تطبیق میں حائل رکاوٹیں

اسلام ایک آفاقی، عالمگیر اور ابدی دین ہے جو ہر زمانے اور ہر خطے کے انسانوں کے لیے مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآنِ مجید اور سنتِ نبویؐ کی صورت میں شریعتِ اسلامیہ نے انسانیت کو ایسے اصول عطا کیے ہیں جو قیامت تک کے لیے قابلِ عمل ہیں۔ اگرچہ شریعت کے بنیادی نصوص محدود ہیں، لیکن انسانی زندگی کے مسائل، حالات اور ضروریات مسلسل تبدیلی اور وسعت کا شکار رہتے ہیں۔ زمانے کے بدلنے کے ساتھ معاشرت، معیشت، سیاست، طب، صنعت اور ذرائع ابلاغ سمیت زندگی کے مختلف شعبوں میں نئے مسائل جنم لیتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں شریعت کے ابدی اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان نئے مسائل کے شرعی حل تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہی ضرورت اجتہاد کو اسلامی نظامِ فکر کا ایک نہایت اہم اور ناگزیر حصہ بناتی ہے۔

اجتہاد دراصل وہ علمی اور فکری کاوش ہے جس کے ذریعے اہلِ علم قرآن وسنت کی روشنی میں ایسے مسائل کے احکام معلوم کرتے ہیں جن کے بارے میں صریح نص موجود نہ ہو۔ یہ شریعتِ اسلامیہ کی وہ متحرک قوت ہے جو ہر دور کے تقاضوں اور پیش آنے والے نئے حالات کے مطابق اسلامی تعلیمات کی رہنمائی کو زندہ اور مؤثر بنائے رکھتی ہے۔ اجتہاد کی بدولت اسلام محض ایک تاریخی مذہب نہیں بلکہ ایک زندہ اور قابلِ عمل نظامِ حیات کے طور پر سامنے آتا ہے، جو ہر زمانے کے انسان کو درپیش مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ای میل: raihanhams6@gmail.com

تاریخِ اسلام اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب تک امتِ مسلمہ میں اجتہاد کی روح زندہ رہی، مسلمانوں نے علم، فکر، تہذیب اور تمدن کے میدان میں غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے ائمۂ مجتہدین نے اپنے اپنے ادوار کے مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا اور اسلامی فقہ کو وسعت بخشی۔ تاہم بعد کے ادوار میں مختلف اسباب کی بنا پر فکری جمود پیدا ہوا، تقلید کے رجحان میں اضافہ ہوا اور اجتہادی سرگرمیاں محدود ہوتی چلی گئیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی علمی وفکری پیش رفت متاثر ہوئی اور بہت سے نئے مسائل کے حل میں مشکلات پیدا ہوئیں۔ عصرِ حاضر میں یہ ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے؛ کیونکہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اور ہر روز ایسے نئے مسائل سامنے آ رہے ہیں جن کا براہِ راست ذکر قدیم فقہی ذخیرے میں نہیں ملتا۔ جدید طبی تحقیقات، مالیاتی معاملات، سماجی تبدیلیاں، ذرائعِ مواصلات کی ترقی اور عالمی سطح پر پیدا ہونے والے نئے حالات نے ایسے بے شمار سوالات کو جنم دیا ہے جن کے بارے میں شرعی رہنمائی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ ان حالات میں اجتہاد ہی وہ ذریعہ ہے جو اسلامی اصولوں کی روشنی میں ان مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے۔

اگرچہ اجتہاد کی اہمیت مسلم ہے؛ لیکن موجودہ دور میں اس کے مؤثر نفاذ کی راہ میں متعدد رکاوٹیں بھی موجود ہیں۔ فکری انتہا پسندی، تقلیدِ جامد، دینی اور عصری علوم کے درمیان فاصلہ، علمی اداروں کی کمزوری، اور اجتماعی سطح پر اجتہادی کوششوں کی کمی ایسے عوامل ہیں جو اس عمل کو دشوار بناتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کے صحیح تصور کو سمجھا جائے، اس کی شرائط اور اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے اور ایسے علمی ماحول کو فروغ دیا جائے جو قرآن وسنت کی روشنی میں نئے مسائل کے حل کی راہ ہموار کر سکے۔ زیرِ نظر مقالے میں اجتہاد کے مفہوم، اس کی اہمیت، تاریخی ارتقا اور عصرِ حاضر میں اس کے عملی اطلاق میں حائل رکاوٹوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا، تاکہ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

اجتہاد کا لغوی واصطلاحی مفہوم

لفظ ''اجتہاد'' عربی زبان کے مادہ ''ج۔ہ۔د'' سے ماخوذ ہے، جس کے بنیادی معنی کسی کام کی انجام دہی میں اپنی پوری قوت، توانائی اور صلاحیت صرف کرنے، مشقت برداشت کرنے اور انتہائی کوشش کرنے کے ہیں۔ اہلِ لغت نے اجتہاد کی تعریف ''بَذْلُ الوُسْعِ وَالْمَجْهُودِ فِي طَلَبِ

الأمر"[۱] کے الفاظ سے کی ہے، یعنی کسی مقصد کے حصول یا کسی معاملے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لانا۔ مشہور لغوی امام ابن منظور نے "لسان العرب" میں لکھا ہے کہ اجتہاد اس کوشش کو کہا جاتا ہے جس میں انسان اپنی پوری طاقت صرف کرے اور اسے مشقت و دشواری کا سامنا ہو۔ اسی لیے عربی زبان میں کسی آسان یا معمولی کام کے لیے کی جانے والی کوشش کو اجتہاد نہیں کہا جاتا، بلکہ یہ لفظ صرف ایسی جدوجہد کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں محنت، مشقت اور بھرپور سعی شامل ہو۔ گویا لغوی اعتبار سے اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی اہم مقصد کے حصول کے لیے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو پوری سنجیدگی اور دل جمعی کے ساتھ استعمال کرے۔[۲] علم صرف کے مطابق لفظ "اجتہاد" بابِ افتعال کا مصدر ہے، جس میں مبالغہ اور بھرپور کوشش کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی لیے اجتہاد سے مراد محض معمولی غور و فکر نہیں، بلکہ کسی مسئلے کے حل یا حکم کے استنباط کے لیے اپنی تمام علمی، فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اجتہاد ایک نہایت اہم، دقیق اور مشقت طلب علمی کوشش ہے۔[۳] اصطلاحِ شرع میں اجتہاد سے مراد شرعی احکام کے استنباط اور ان کے فہم کے لیے اپنی تمام علمی اور فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ چونکہ شریعت کے بنیادی مصادر قرآنِ کریم اور سنتِ نبویؐ ہیں؛ اس لیے اجتہاد کا مقصد انہی مصادر سے نئے پیش آمدہ مسائل کے احکام معلوم کرنا ہوتا ہے۔ علمِ اصولِ فقہ کے ائمہ نے اجتہاد کی مختلف جامع تعریفیں بیان کی ہیں جن میں اس عمل کی نوعیت اور حدود کو واضح کیا گیا ہے۔

امام شوکانیؒ اجتہاد کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "**استفراغُ الوُسعِ في دركِ الأحكامِ الشرعية.**"[۴] "یعنی شرعی احکام کے ادراک اور ان کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری قوت اور صلاحیت صرف کر دینا"۔ اسی طرح علامہ آمدیؒ فرماتے ہیں: "**الاجتهادُ هو استفراغُ الوُسعِ فی طلبِ الظنِّ بشيءِ من الاحكامِ الشرعيةِ علی وجهٍ يُحِسّ من النفسِ العجزَ عن المزيدِ فيه**"[۵] یعنی اجتہاد یہ ہے کہ کسی شرعی حکم کے غالب گمان تک پہنچنے کے لیے انسان اپنی تمام تر کوششیں اس طرح صرف کرے کہ اسے محسوس ہو جائے کہ اب مزید کوشش کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مصر کے دار الافتاء کے مطابق اجتہاد وہ علمی کاوش ہے جس میں قرآن و سنت کے دلائل میں غور و فکر، ترجیح اور استنباط کے ذریعے احکام اخذ کیے جاتے ہیں اور پھر انہیں پیش آمدہ مسائل اور عملی حالات پر منطبق کیا جاتا ہے۔[۶]

ان تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ اجتہاد محض رائے زنی یا ذاتی سوچ کا نام نہیں، بلکہ ایک منظّم، اصولی اور گہرا علمی عمل ہے جس کے ذریعے اہلِ علم قرآن وسنت کی روشنی میں نئے مسائل کے شرعی احکام دریافت کرتے ہیں۔ برصغیر کے عظیم محدث، مفکر اور مجدد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معروف کتاب **عقد الجید فی أحکام الاجتھاد والتقلید** میں اجتہاد کی نہایت جامع اور متوازن تعریف پیش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: "**الاجتهاد على ما يفهم من كلام العلماء استفراغ الجهد في إدراك الأحكام الشرعية الفرعية من أدلتها التفصيلية الراجعة كلياتها إلى أربعة أقسام: الكتاب والسنة والإجماع والقياس.**"[۷] یعنی علماء کے کلام سے جو مفہوم سامنے آتا ہے، اس کے مطابق اجتہاد یہ ہے کہ شریعت کے فرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کے ذریعے معلوم کرنے کے لیے پوری علمی اور فکری کوششیں بروئے کار لائی جائیں، جبکہ ان تمام دلائل کی بنیاد قرآن، سنت، اجماع اور قیاس پر ہو۔

شاہ ولی اللہؒ کی اس تعریف کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اجتہاد کو محض نئی آراء پیش کرنے یا سابقہ ائمہ سے اختلاف کرنے تک محدود نہیں رکھا۔ ان کے نزدیک اجتہاد کا دائرہ ان مسائل کو بھی شامل ہے جن پر پہلے اہلِ علم گفتگو کر چکے ہوں۔ چنانچہ اگر کوئی صاحبِ علم قرآن وسنت، اصولِ شریعت اور فقہی دلائل کی روشنی میں غور وفکر کرنے کے بعد اسی رائے تک پہنچے جسے پہلے کسی مجتہد امام نے اختیار کیا تھا، تو یہ بھی اجتہاد ہی کی ایک صورت ہے اور ایسے عالم کو محض مقلد یا غیر مجتہد قرار دینا درست نہیں۔ شاہ صاحب اس تصور کی بھی تردید کرتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے یا بعد کے ادوار میں مجتہد پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک ہر دور میں ایسے اہلِ علم پیدا ہو سکتے ہیں جو مطلوبہ علمی شرائط پوری کرتے ہوئے مسائلِ زمانہ میں اجتہادی بصیرت سے رہنمائی فراہم کریں۔ اس طرح شاہ ولی اللہؒ نے ایک طرف تقلیدِ جامد کے جمود سے اجتناب کیا اور دوسری طرف بے لگام اور غیر منضبط اجتہاد کی حوصلہ شکنی کی۔ ان کا پیش کردہ اعتدال پسند نقطۂ نظر شریعت کے مقاصد، امت کی علمی روایت اور انسانی فطرت؛ تینوں کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

اجتہاد کی شرعی بنیادیں

اجتہاد کی بنیادیں قرآنِ مجید میں واضح طور پر موجود ہیں۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں لفظ ''اجتہاد''

بطور اصطلاح صراحت کے ساتھ مذکور نہیں، تاہم متعدد آیات ایسی ہیں جو غور و فکر، تدبر، استنباط اور احکام کے استخراج کی ترغیب دیتی ہیں۔ انہی آیات سے فقہاء و اصولیین نے اجتہاد کی مشروعیت اور اہمیت کو ثابت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ '' (سورۃ الحشر:۲) ترجمہ: پس عبرت حاصل کرو اے اہلِ بصیرت۔

اس آیتِ مبارکہ میں اہلِ عقل و دانش کو غور و فکر اور نتائج اخذ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اصولِ فقہ کے علماء نے اس آیت سے قیاس اور اجتہاد کے جواز پر استدلال کیا ہے، کیونکہ ''اعتبار'' کا مفہوم ایک معاملے کو دوسرے معاملے پر منطبق کر کے اس سے حکم اور سبق اخذ کرنا بھی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ'' (سورۃ النساء:۸۳) ترجمہ: ''اور اگر وہ اس معاملے کو رسول اور اپنے اہلِ اختیار کے سپرد کر دیتے تو ان میں سے وہ لوگ اسے جان لیتے جو اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں ''يَسْتَنبِطُونَهُ'' کا لفظ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ استنباط کے معنی ہیں کسی پوشیدہ حقیقت یا حکم کو غور و فکر کے ذریعے ظاہر کرنا۔ یہی عمل فقہی اصطلاح میں اجتہاد کہلاتا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے ایسے اہلِ علم کے وجود کو تسلیم کیا ہے جو نصوصِ شرعیہ میں غور و فکر کر کے مسائل و احکام اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نہ صرف اجتہاد کی طرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ اہلِ استنباط کے علمی مقام کو بھی واضح کرتا ہے۔

احادیثِ نبویؐ سے اجتہاد کا ثبوت

اجتہاد کی مشروعیت اور اس کی اہمیت صرف قرآنِ مجید ہی سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ احادیثِ نبویؐ میں بھی اس کے واضح شواہد موجود ہیں۔ رسول اللہؐ نے مختلف مواقع پر اپنے صحابہ کرامؓ کو غور و فکر اور استنباطِ احکام کی ترغیب دی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد اسلامی شریعت کا ایک مسلمہ اور معتبر اصول ہے۔ اس سلسلے میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی مشہور روایت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کا قاضی اور داعی بنا کر روانہ فرمایا تو ان سے دریافت کیا: كَيْفَ تَقْضِي إِذَا عُرِضَ لَكَ قَضَاءٌ؟ یعنی ''جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ یا مسئلہ پیش ہوگا تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا: ''أَقْضِي بِكِتَابِ اللَّهِ''. '' میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔'' آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: "فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ؟" "اگر اللہ کی کتاب میں اس کا حکم نہ ملے تو؟ انھوں نے عرض کیا: فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ" "پھر میں رسول اللہؐ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ دریافت فرمایا: "فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰه وَلَا فِي كِتَابِ اللّٰه؟" "اگر کتاب اللہ اور سنتِ رسول دونوں میں اس کا صریح حکم نہ ملے تو؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا: "أَجْتَهِدُ بِرَأْيِي وَلَا آلو" "تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوشش میں کوئی کمی نہیں چھوڑوں گا۔" یہ سن کر رسول اللہؐ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللّٰهِ لِمَا يُرْضِي رَسُولَ اللّٰهِ" "تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔[۸]

یہ حدیث اس بات کی روشن دلیل ہے کہ جہاں قرآن وسنت میں کسی مسئلے کا صریح حکم موجود نہ ہو وہاں اہلِ علم کے لیے اجتہاد کرنا جائز بلکہ ضروری ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہؐ نے اجتہاد کرنے والے اہلِ علم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا: "إِذَا اجْتَهَدَ الْحَاكِمُ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا اجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ"[۹] یعنی: "جب کوئی حاکم یا قاضی اجتہاد کرے اور صحیح نتیجے تک پہنچ جائے تو اسے دوہرا اجر ملتا ہے، اور اگر پوری کوشش کے باوجود خطا کر بیٹھے تو بھی اسے ایک اجر ملتا ہے"۔ یہ حدیث اجتہاد کی اہمیت اور اس کے شرعی مقام کو واضح کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں خلوص، علمی دیانت اور مکمل کوشش کے ساتھ کیا جانے والا اجتہاد قابلِ قدر ہے، اور اگر مجتہد سے خطا بھی ہو جائے تو وہ عنداللہ معذور اور اجر کا مستحق رہتا ہے۔

علمائے اصولِ فقہ نے اجتہاد کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ یہ تقسیم دراصل مجتہد کے علمی مرتبے، اس کے دائرۂ کار اور استنباطِ احکام کے طریقۂ کار کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ چند اہم اقسام درج ذیل ہیں:[۱۰]

۱۔ اجتہادِ مطلق

اجتہادِ مطلق اجتہاد کا سب سے بلند اور اعلیٰ درجہ ہے۔ اس درجے کا مجتہد براہِ راست قرآنِ مجید، سنتِ نبویؐ، اجماع اور قیاس سے احکامِ شرعیہ اخذ کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ کسی سابق امام یا فقہی مکتبِ فکر کی تقلید کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اپنے اصول وقواعد کی روشنی میں مسائل کا استنباط کرتا ہے۔ ایسے مجتہد کو "مجتهد فى الشرع" بھی کہا جاتا ہے۔ ائمہ اربعہ: امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور

امام احمد بن حنبلؒ اسی مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ فقہاء کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک یہ درجہ نہایت نادر ہے اور اس نوعیت کا اجتہاد عملاً بہت کم پایا جاتا ہے۔

۲۔ اجتہادِ منتسب

اجتہادِ منتسب یا "**اجتهاد في المذهب**" اس اجتہاد کو کہا جاتا ہے جس میں مجتہد کسی مخصوص فقہی مکتبِ فکر کے اصول وضوابط کا پابند رہتے ہوئے نئے پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنے امام کے مقرر کردہ اصولوں سے انحراف نہیں کرتا، البتہ انہی اصولوں کی روشنی میں ایسے مسائل میں اجتہاد کرتا ہے جن پر سابقہ فقہاء نے صراحت نہ کی ہو۔ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے متعدد نامور علماء اسی درجے کے مجتہد شمار ہوتے ہیں۔ اکابر علماء کے نزدیک یہ دروازہ ہر زمانے میں کھلا رہا ہے اور عصرِ حاضر میں ہونے والے بیشتر فقہی فیصلے اسی نوعیت کے اجتہاد کی مثال ہیں۔

۳۔ اجتہادِ جزئی

اجتہادِ جزئی یہ ہے کہ کوئی عالم دین کسی خاص فن، باب یا مخصوص مسئلے میں گہری مہارت حاصل کر کے اس کے متعلق اجتہادی رائے قائم کرے۔ اس نوعیت کا اجتہاد عمومی اور ہمہ جہت نہیں ہوتا بلکہ ایک محدود دائرے تک رہتا ہے۔ موجودہ دور میں مختلف شعبوں کے ماہر علماء، مثلاً مالیاتی، طبی یا خاندانی مسائل کے ماہرین، اسی نوعیت کے اجتہاد سے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ اجتہادِ اجتماعی

اجتہادِ اجتماعی وہ صورت ہے جس میں متعدد اہلِ علم، فقہاء اور مختلف علوم کے ماہرین باہمی مشاورت کے ذریعے کسی مسئلے کا شرعی حل تلاش کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے پیچیدہ اور ہمہ جہت مسائل کے پیشِ نظر اس طرزِ اجتہاد کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اسلامی فقہی اکیڈمیاں، دارالافتاء اور علمی مجالس اسی مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔ اجتماعی اجتہاد کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں مختلف علمی زاویے یکجا ہو جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں زیادہ متوازن، جامع اور قابلِ عمل فیصلے سامنے آتے ہیں۔ اسی بنا پر موجودہ دور میں اسے اجتہاد کی سب سے مؤثر اور موزوں صورت قرار دیا جاتا ہے۔

مجتہد کے لیے ضروری شرائط

اصولِ فقہ کے ائمہ نے اجتہاد کو دین کا نہایت حساس اور ذمہ دار علمی منصب قرار دیا ہے۔ اسی لیے ہر شخص کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں، بلکہ اس کے لیے مخصوص علمی، فکری اور اخلاقی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ان شرائط کا تذکرہ امام غزالیؒ کی المستصفی، ملا جیونؒ کی نور الانوار، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی **عقد الجید فی أحکام الاجتهاد و التقلید**، مفتی محمد تقی امینی کی **اجتہاد** اور دیگر کتبِ اصولِ فقہ میں ملتا ہے۔ مختصراً ایک مجتہد کے لیے درج ذیل شرائط ضروری سمجھی گئی ہیں:

۱۔ قرآنِ کریم کی آیاتِ احکام پر گہری دسترس اور ان کے ناسخ و منسوخ، عام و خاص اور دیگر اصولی مباحث کا علم۔

۲۔ احادیثِ احکام کا وسیع علم اور ان کی اسناد، رواۃ اور مفاہیم سے واقفیت۔

۳۔ اجماعِ امت اور فقہی تاریخ کا علم تاکہ اجماعی مسائل کے خلاف رائے قائم نہ ہو۔

۴۔ قیاس اور اصولِ استنباط میں مہارت اور دیگر فقہی دلائل سے واقفیت۔

۵۔ اصولِ فقہ اور قواعدِ فقہیہ کا علم جن پر فقہی احکام کی بنیاد قائم ہے

۶۔ فقہی جزئیات اور سابقہ ائمہ کے اجتہادات سے آگاہی

۷۔ عربی زبان، نحو، صرف، لغت اور بلاغت پر مکمل عبور

۸۔ عصری حالات، معاشرتی تقاضوں اور زمانے کے مسائل سے واقفیت

۹۔ صحابہ کرامؓ اور ائمۂ مجتہدین کے اختلافات اور ان کے دلائل کا علم

۱۰۔ مقاصدِ شریعت اور مصالحِ انسانی کی گہری سمجھ

۱۱۔ اسلام، بلوغ، عقل، عدالت اور فقہی بصیرت جیسی بنیادی اہلیتوں کا پایا جانا

۱۲۔ تقویٰ، اخلاص اور قلبی بصیرت جو صحیح اجتہاد میں معاون ثابت ہوتی ہے۔[۱۱]

ان شرائط سے واضح ہوتا ہے کہ اجتہاد محض ذاتی رائے کا نام نہیں، بلکہ ایک عظیم علمی ذمہ داری ہے جس کے لیے گہرے دینی علم، وسیع مطالعے، فکری پختگی اور روحانی بالیدگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اجتہاد کا تاریخی ارتقاء

اسلامی فقہ میں اجتہاد کا سفر مختلف تاریخی مراحل سے گزرا ہے۔ ہر دور میں حالات اور

ضروریات کے مطابق اجتہاد کی نوعیت اور اسلوب میں تبدیلی آتی رہی، تاہم اس کا بنیادی مقصد قرآن و سنت کی روشنی میں انسانی زندگی کے مسائل کا حل فراہم کرنا رہا ہے۔ اجتہاد کے ارتقاء کو عموماً پانچ اہم ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ عہدِ رسالتؐ

یہ اجتہاد کا ابتدائی اور بنیادی دور تھا۔ اس زمانے میں شریعت کا اصل سرچشمہ وحیِ الٰہی تھی۔ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو اس کا حل قرآنِ کریم یا براہِ راست نبویؐ راہنمائی کے ذریعے فراہم کیا جاتا۔ بعض مواقع پر رسول اللہؐ اجتہاد فرماتے اور وحی کے ذریعے اس کی تائید کر دی جاتی۔ اس طرح اجتہاد کی عملی بنیاد اسی مبارک دور میں قائم ہوئی۔

۲۔ عہدِ صحابہ

رسول اللہ ? کے وصال کے بعد اسلامی ریاست کی حدود وسیع ہوئیں اور نئے مسائل سامنے آنے لگے۔ ایسے حالات میں صحابہ کرامؓ نے قرآن و سنت کو بنیاد بنا کر اجتہاد کیا۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر جلیل القدر صحابہؓ نے باہمی مشاورت اور غور و فکر کے ذریعے بے شمار مسائل کے شرعی احکام متعین کیے۔ اس دور میں اجتہاد کو غیر معمولی وسعت حاصل ہوئی۔

۳۔ عہدِ تابعین اور تبع تابعین

یہ فقہ کی تدوین اور علمی استحکام کا دور تھا۔ تابعین اور تبع تابعین نے صحابہ کرامؓ کے اجتہادات سے استفادہ کرتے ہوئے فقہی مسائل کو منظّم شکل دی۔ اسی دور میں فقہی مکاتبِ فکر وجود میں آئے اور فقہ اسلامی کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے عظیم ائمہ نے اصولِ فقہ اور استنباطِ احکام کے ایسے مناہج مرتب کیے جن سے بعد کے ادوار نے بھرپور استفادہ کیا۔

۴۔ عہدِ تقلید و استحکام

اس دور میں فقہی مذاہب پوری طرح منظّم ہو چکے تھے اور فقہ کی عظیم کتابیں مرتب ہوئیں۔

علماء نے ائمہ مجتہدین کے قائم کردہ اصولوں کو بنیاد بنا کر فقہی مسائل کی تشریح و توضیح کی۔ اگرچہ اس زمانے میں اجتہادی سرگرمیاں مکمل طور پر ختم نہیں ہوئیں، تاہم عمومی رجحان تقلید اور سابقہ فقہی ذخیرے سے استفادے کی طرف بڑھ گیا، جس کے نتیجے میں اجتہادِ مطلق نسبتاً کم ہوتا گیا۔

۵۔ عہدِ حاضر اور اجتماعی اجتہاد

موجودہ دور میں سائنسی ترقی، جدید معاشی نظام، طبی تحقیقات، ذرائعِ ابلاغ اور عالمی تبدیلیوں نے بے شمار نئے مسائل جنم دیے ہیں۔ ان پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے انفرادی اجتہاد کے ساتھ ساتھ اجتماعی اجتہاد کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ چنانچہ مختلف فقہی اکیڈمیوں، دارالافتاؤں اور علمی اداروں نے اجتماعی غور و فکر کے ذریعے جدید مسائل کے شرعی احکام متعین کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ عصرِ حاضر میں اجتماعی اجتہاد کو اجتہاد کی سب سے مؤثر اور موزوں صورت تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ اس میں مختلف علوم کے ماہرین کی آراء اور تجربات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔[۱۲]

اس تاریخی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اجتہاد ہر دور میں اسلامی شریعت کی حیات، وسعت اور عملی افادیت کا اہم ذریعہ رہا ہے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے باوجود اجتہاد نے شریعت اور انسانی زندگی کے درمیان مضبوط تعلق کو برقرار رکھنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

اجتہاد کی ضرورت و اہمیت

اجتہاد اسلامی شریعت کی حیات، وسعت اور ہمہ گیری کا ایک بنیادی مظہر ہے۔ یہ وہ ذریعہ ہے جس سے شریعت کے ابدی اصولوں کو ہر دور کے نئے حالات اور پیش آمدہ مسائل پر منطبق کیا جاتا ہے۔ اگر اجتہاد کا عمل نہ ہو تو بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں اور نئے مسائل کے بارے میں شرعی رہنمائی فراہم کرنا دشوار ہو جائے۔ اسی لیے علماء نے اجتہاد کو شریعت کی بقا، ترقی اور عملی افادیت کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ معروف معاصر اسلامی مفکر علامہ یوسف القرضاویؒ کے مطابق اجتہاد شریعت کو تازگی، وسعت اور فکری زرخیزی عطا کرتا ہے اور اسے انسانی زندگی کی رہنمائی اور قیادت کے قابل بناتا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد ہی وہ ذریعہ ہے جس کی بدولت شریعت ہر دور کے تقاضوں کا جواب دیتی ہے، جبکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود بھی محفوظ رہتی ہیں اور بندگانِ خدا کے حقوق بھی ضائع

نہیں ہوتے۔[۱۳] اسی طرح ممتاز فقیہ اور اصولی عالم ڈاکٹر وہبہ الزحیلیؒ کا کہنا ہے کہ علومِ اسلامیہ کی تدوین، فقہی ذخیرے کی وسعت اور مختلف علمی موضوعات پر بے شمار تصنیفات کی موجودگی نے اجتہاد کے عمل کو مزید مضبوط بنیادیں فراہم کر دی ہیں۔ ان کے نزدیک ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق کسی نہ کسی درجے میں اجتہاد کا فریضہ انجام دیا ہے، اور یہی عمل اسلامی فقہ کی مسلسل نشو ونما اور ارتقا کا سبب بنتا رہا ہے۔[۱۴]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی متعدد تصانیف، خصوصاً تجدید و احیائے دین اور تفہیمات میں اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد اسلامی شریعت کی زندگی، حرکت اور ارتقائی صلاحیت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر اجتہاد کا دروازہ بند سمجھ لیا جائے تو دین کی عملی رہنمائی محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور نئے پیش آنے والے مسائل کے حل میں دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تاہم مولانا مودودیؒ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اجتہاد ایک نہایت نازک اور ذمہ دارانہ علمی کوشش ہے، جسے ہر شخص انجام نہیں دے سکتا۔ انہوں نے ان لوگوں پر تنقید کی جو دینی علوم میں گہری مہارت حاصل کیے بغیر محض جدید رجحانات یا بیرونی افکار کے زیرِ اثر اجتہاد کے دعوے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اجتہاد کا حق صرف انہی اہلِ علم کو حاصل ہے جو قرآن و سنت، عربی زبان، اصولِ فقہ اور اسلامی علوم پر مضبوط دسترس رکھتے ہوں۔ مولانا مودودیؒ واضح کرتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ یقیناً کھلا ہے، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مجتہد شریعت کے مزاج، اس کے اصولوں اور مقاصد سے پوری طرح واقف ہو۔ اگر کوئی شخص مطلوبہ علمی اہلیت اور دینی بصیرت کے بغیر اجتہاد کی کوشش کرے تو اس کے نتیجے میں اصلاح کے بجائے گمراہی اور انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد کا مقصد شریعت میں تبدیلی لانا نہیں، بلکہ اس کے ابدی اصولوں کی روشنی میں نئے مسائل کا صحیح حل تلاش کرنا ہے۔ مولاناؒ اس حقیقت کو ایک سادہ مثال سے واضح کرتے ہیں کہ جس طرح طب کے میدان میں مہارت حاصل کیے بغیر کوئی شخص معالج نہیں بن سکتا، اسی طرح دینی علوم میں گہری مہارت کے بغیر کسی کو شریعت کے احکام میں رائے دینے کا حق حاصل نہیں۔ لہٰذا اجتہاد کے لیے اخلاص کے ساتھ ساتھ وسیع علم، فقہی بصیرت اور شریعت کے مقاصد سے مکمل آگاہی بھی ناگزیر ہے۔[۱۵]

ممتاز محقق مولانا محمد تقی امینیؒ نے اپنی وقیع کتاب ''اجتہاد کا تاریخی پس منظر'' میں اجتہاد کی حقیقت، اس کے تدریجی ارتقاء، توضیحی و استنباطی اجتہاد اور مجتہدین کے طریقِ کار پر سیر حاصل بحث کی

ہے۔ان کی تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ احکامِ شرعیہ میں حالات اور زمانہ کی رعایت ہمیشہ شریعت کا حصہ رہی ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ دائرے کے اندر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کے بغیر شریعت کی آفاقیت اور عملی رہنمائی کا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہی وہ علمی ذریعہ ہے جو اسلامی تعلیمات کو ہر زمانے میں زندہ، مؤثر اور قابلِ عمل بنائے رکھتا ہے۔

اجتہاد کا نفاذ: مسائل و مشکلات

ا۔علمی و فکری رکاوٹیں

اگرچہ اجتہاد اسلامی شریعت کی بقا، وسعت اور عصری رہنمائی کے لیے ناگزیر ہے، تاہم موجودہ دور میں اس کے مؤثر اطلاق اور عملی نفاذ کی راہ میں متعدد علمی اور فکری رکاوٹیں موجود ہیں۔ان رکاوٹوں کو سمجھے بغیر اجتہاد کے صحیح تصور اور اس کے مطلوبہ نتائج تک پہنچنا ممکن نہیں۔

شرائطِ اجتہاد کی دشواری اور وسعت: اجتہاد ایک نہایت بلند علمی منصب ہے جس کے لیے قرآنِ کریم، حدیثِ نبویؐ، اصولِ فقہ، مقاصدِ شریعت، فقہی ذخیرے اور عربی زبان پر گہری دسترس ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اسلامی علوم میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو چکی ہے اور ہر علم اپنی جگہ ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اسی لیے موجودہ دور میں ایک ہی شخص کے لیے تمام مطلوبہ علوم پر یکساں مہارت حاصل کرنا نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ مشہور مؤرخ اور مفکر علامہ ابنِ خلدونؒ نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ علومِ شریعت اور ان کے متعلقات اس قدر پھیل چکے ہیں کہ کسی ایک فرد کے لیے ان کا مکمل احاطہ کرنا آسان نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔

اجتہاد اور تجدید کے مفاہیم میں خلطِ مبحث: موجودہ زمانے میں ایک اہم فکری رکاوٹ یہ بھی ہے کہ بعض حلقوں نے اجتہاد اور تجدید کے مفاہیم کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ بعض لوگ اجتہاد کے نام پر ایسی آراء پیش کرتے ہیں جو شریعت کے مسلمہ اصولوں اور قطعی نصوص سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں، حالانکہ اجتہاد کا مقصد دین میں تبدیلی پیدا کرنا نہیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ اہلِ علم نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ اجتہاد کی حدود نصوصِ قطعیہ کے تابع ہیں اور کوئی بھی اجتہادی رائے قرآن و سنت کے واضح اور قطعی احکام کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اجتہاد اور بے جا آزادیِ فکر کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۲۔تقلیدِ جامد اور مسلکی تعصب

اجتہاد کے مؤثر نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ تقلیدِ جامد اور مسلکی تعصب کو قرار دیا جاتا ہے۔ تاریخِ فقہ کے بعض ادوار میں یہ تصور عام ہوتا گیا کہ ائمۂ متقدمین کے بعد اجتہادِ مطلق کا دروازہ عملاً بند ہو چکا ہے، جس کے نتیجے میں بہت سے اہلِ علم نے نئے مسائل میں آزادانہ غور وفکر کے بجائے صرف سابقہ آراء پر اکتفا کرنا شروع کر دیا۔اس رجحان نے اجتہادی فکر کی وسعت کو محدود کر دیا اور فقہی جمود کو فروغ ملا۔

علامہ شوکانیؒ نے اپنی معروف کتاب: ارشاد الفحول میں اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اجتہاد کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جب بھی اس کی شرائط پائی جائیں، اجتہاد کا حق برقرار رہتا ہے۔اسی طرح مسلم الثبوت کے مصنف نے بھی اس خیال کو بے بنیاد قرار دیا ہے اور اسے علمی کمزوری کا نتیجہ بتایا ہے۔[۱۶]

مسلکی تعصب بھی اجتہاد کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔ بسا اوقات ایک فقہی مکتبِ فکر سے وابستہ علماء دوسرے مکاتبِ فکر کی تحقیقات اور علمی آراء سے استفادہ کرنے سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ ائمہ مجتہدین نے خود کبھی اپنے اقوال کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا۔امام ابوحنیفہؒ کا مشہور قول ہے:"**هذا رأيي وهو أحسن ما قدرتُ عليه، فمن جاء بأحسن منه قبلناه**" یعنی یہ میری رائے ہے اور میری استطاعت کے مطابق بہترین رائے ہے، لیکن اگر کوئی اس سے بہتر بات پیش کرے تو ہم اسے قبول کر لیں گے۔

یہ طرزِ فکر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اسلامی فقہ کی اصل روح وسعتِ نظر، علمی دیانت اور حق کی تلاش ہے، نہ کہ مسلکی جمود اور غیر ضروری تعصب۔لہٰذا عصرِ حاضر میں اجتہاد کے فروغ کے لیے تقلید جامد اور مسلکی تنگ نظری سے بالاتر ہو کر علمی مکالمے اور باہمی استفادے کی فضا قائم کرنا ناگزیر ہے۔

۳۔فکری انتہا پسندی

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی نے اپنی کتاب: عصرِ حاضر میں اجتہاد: چند فکری و عملی مباحث میں اجتہاد کی راہ میں حائل فکری رکاوٹوں کا نہایت بصیرت افروز جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق آج مسلم معاشرہ دو انتہاؤں میں تقسیم ہو چکا ہے، اور یہی تقسیم اجتہاد کے صحیح عمل میں سب

سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔ ایک طرف قدامت پسند حلقے ہیں جو اس خوف میں مبتلا ہیں کہ اجتہاد کے نام پر دینی احکام میں بے جا تبدیلیاں کی جائیں گی، اس لیے وہ ہر نئی اجتہادی کوشش کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دوسری طرف تجدد پسند طبقہ ہے جو بعض اوقات شریعت کے مسلمہ اصولوں اور حدود کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر چیز کو نئے سرے سے تشکیل دینے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ مولانا زاہدالراشدی کے نزدیک ان دونوں انتہاؤں کے درمیان توازن، اعتدال اور سنجیدہ علمی مکالمہ ناگزیر ہے۔ جب تک تحفظ اور پیش رفت کے درمیان مناسب توازن پیدا نہیں ہوگا، اس وقت تک صحیح معنوں میں مؤثر اور قابلِ قبول اجتہادی فضا قائم نہیں ہو سکے گی۔ [۱۷]

۴۔ سیاسی وسماجی رکاوٹیں

اجتہاد کے مؤثر نفاذ میں صرف علمی اور فکری مشکلات ہی حائل نہیں ہوتیں بلکہ سیاسی اور سماجی عوامل بھی اس کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ تاریخِ اسلام اور موجودہ حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آزادانہ علمی، فکر اور اجتہادی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے سازگار ماحول نہایت ضروری ہے۔

علمی آزادی کا فقدان: تاریخ کے بعض ادوار میں اہلِ علم کو سیاسی دباؤ اور حکومتی مداخلت کا سامنا کرنا پڑا، جس کے باعث آزادانہ اجتہاد اور علمی اظہار محدود ہو گیا۔ بعض حکمرانوں نے مخصوص نظریات کو سرکاری حیثیت دینے کی کوشش کی، جس سے علمی اختلافِ رائے متاثر ہوا۔ اس صورتِ حال نے تحقیق، استنباط اور آزادانہ فقہی فکر کے فروغ میں رکاوٹ پیدا کی اور اہلِ علم کو احتیاط اور خاموشی پر مجبور کر دیا۔

سماجی دباؤ اور تبدیلی کا خوف: بعض مسلم معاشروں میں نئی علمی آراء اور اجتہادی مباحث کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عوام کی ایک بڑی تعداد ہر نئی رائے کو دین میں تبدیلی یا تحریف سمجھنے لگتی ہے، جس کے نتیجے میں علماء جدید مسائل پر کھل کر گفتگو کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ سماجی رویہ اجتہادی فکر کی نشوونما میں ایک اہم رکاوٹ بن جاتا ہے اور علمی پیش رفت کی رفتار کو سست کر دیتا ہے۔

استعماری دور کے اثرات: نوآبادیاتی دور میں متعدد مسلم ممالک کے قانونی اور انتظامی نظام مغربی قوانین کے زیرِ اثر آ گئے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی فقہ کا عملی دائرۂ کار محدود ہوتا چلا گیا اور بہت سے شعبوں میں شریعت کی براہِ راست تطبیق کم ہو گئی۔ جب فقہ اسلامی کی عملی ضرورت کم ہوئی تو اجتہاد

کے مواقع اور اس کی سماجی اہمیت بھی متاثر ہوئی۔ اس کے اثرات آج تک مسلم معاشروں میں کسی نہ کسی صورت میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ان سیاسی اور سماجی رکاوٹوں کے باعث اجتہاد کا عمل اپنی مطلوبہ وسعت اور تاثیر حاصل نہیں کر پاتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ علمی آزادی، مثبت مکالمے اور فکری برداشت کو فروغ دیا جائے تاکہ اجتہاد اپنے حقیقی کردار کے ساتھ امت کی رہنمائی کر سکے۔

۵۔ عصری علوم سے ناآشنائی

عصرِ حاضر میں اجتہاد کی راہ میں حائل اہم رکاوٹوں میں سے ایک عصری علوم سے عدم واقفیت ہے۔ موجودہ زمانے کے مسائل اپنی نوعیت، وسعت اور پیچیدگی کے اعتبار سے ماضی کے مسائل سے کہیں زیادہ مختلف ہیں۔ جدید طب، جینیات، مالیاتی نظام، ذرائعِ ابلاغ، مصنوعی ذہانت اور دیگر جدید شعبوں میں ایسے بے شمار سوالات پیدا ہو رہے ہیں جن کے شرعی احکام متعین کرنے کے لیے ان علوم کی بنیادی اور عملی سمجھ ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مسئلے کا درست شرعی حکم اسی وقت معلوم کیا جا سکتا ہے جب پہلے اس مسئلے کی حقیقت اور اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ چنانچہ طبی، معاشی یا سائنسی مسائل میں اجتہاد کے لیے متعلقہ علوم سے واقفیت ناگزیر ہے۔ تاہم موجودہ تعلیمی نظام میں ایک واضح خلا پایا جاتا ہے۔ روایتی دینی مدارس میں جدید علوم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی، جبکہ جدید جامعات میں اسلامی شریعت اور فقہی اصولوں کا گہرا مطالعہ عموماً موجود نہیں ہوتا۔ دینی اور عصری علوم کے درمیان یہی فاصلہ اجتہاد کے مؤثر اور جامع عمل میں ایک بڑی علمی رکاوٹ بن گیا ہے۔ اسی وجہ سے عصرِ حاضر کے بہت سے اہلِ علم اجتماعی اجتہاد اور مختلف شعبوں کے ماہرین کے باہمی تعاون کو ناگزیر قرار دیتے ہیں، تاکہ دینی بصیرت اور عصری آگاہی کو یکجا کر کے جدید مسائل کا متوازن اور مستند حل پیش کیا جا سکے۔

۶۔ اجتہادی اداروں کا فقدان

عصرِ حاضر میں اجتہاد کے مؤثر نفاذ کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ مضبوط اور منظم اجتہادی اداروں کی کمی ہے۔ موجودہ دور کے پیچیدہ اور ہمہ جہت مسائل کا حل صرف انفرادی علمی کوششوں سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے اجتماعی علمی کاوش اور ادارہ جاتی نظم و نسق کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے علامہ یوسف القرضاویؒ اور دیگر معاصر علماء نے اجتماعی اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس بات کی وکالت کی

ہے کہ اجتہادی فیصلے ایسے علمی فورمز اور مجالس کے ذریعے سامنے آئیں جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء کے ساتھ ساتھ طب، معیشت، قانون، سماجیات اور دیگر عصری علوم کے ماہرین بھی شریک ہوں۔[۱۸]

اس طرزِ عمل سے ایک جانب مسئلے کی حقیقی نوعیت کو بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور دوسری جانب شرعی احکام کے استنباط میں زیادہ جامع اور متوازن نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اگرچہ عالمِ اسلام میں اسلامی فقہ اکیڈمی اور دیگر متعدد اجتہادی ادارے قائم ہیں اور وہ اہم علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، تاہم ان کے فیصلوں کو عمومی طور پر لازمی حیثیت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی سفارشات عوامی سطح پر مطلوبہ اثرات مرتب کر پاتی ہیں۔ چنانچہ ایک مؤثر، منظّم اور ہمہ گیر اجتہادی نظام کا قیام آج بھی امتِ مسلمہ کی اہم ضرورتوں میں شمار ہوتا ہے۔

۷۔ دین اور سیاست کا غیر متوازن امتزاج

اجتہاد کے صحیح اور غیر جانب دارانہ اطلاق میں ایک اہم رکاوٹ دین اور سیاست کا غیر متوازن امتزاج بھی ہے۔ مختلف ادوار میں بعض سیاسی اور نظریاتی تحریکوں نے اپنے مخصوص مقاصد اور افکار کو اجتہاد کا عنوان دے کر پیش کیا، جس کے نتیجے میں اجتہاد کے حقیقی علمی اور شرعی تصور کو نقصان پہنچا۔ اس طرزِ عمل نے عوام کے ایک طبقے میں اجتہاد کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے اور اس کی علمی حیثیت کو متنازع بنا دیا۔ دوسری جانب بعض مواقع پر حکمران طبقوں نے اپنی سیاسی ترجیحات کے مطابق مذہبی آراء اور فتاویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی، جس سے علمی آزادی اور غیر جانب دار اجتہادی فکر متاثر ہوئی۔ جب اجتہاد علمی تحقیق کے بجائے سیاسی مفادات کے تابع ہو جائے تو اس کی ساکھ مجروح ہوتی ہے اور اس پر عوام کا اعتماد کمزور پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا اجتہاد کے مؤثر اور قابلِ اعتماد فروغ کے لیے ضروری ہے کہ اسے سیاسی دباؤ، گروہی مفادات اور نظریاتی تعصّبات سے محفوظ رکھا جائے، تاکہ یہ خالص علمی، شرعی اور اصلاحی بنیادوں پر امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے۔[۱۹]

عملی تجاویز:

۱۔ اجتماعی اجتہاد کا فروغ

موجودہ دور کے پیچیدہ اور ہمہ جہت مسائل کا تقاضا ہے کہ اجتہاد کو صرف انفرادی کوششوں

تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اجتماعی اجتہاد کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے فقہاء، محدثین، اصولیین اور مختلف عصری علوم کے ماہرین کو ایک مشترکہ علمی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے تاکہ ہر مسئلے کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا جا سکے۔ اجتماعی اجتہاد نہ صرف فیصلہ سازی کو زیادہ جامع اور متوازن بناتا ہے بلکہ غلطی کے امکانات کو بھی کم کر دیتا ہے اور امت میں اس کے نتائج کو زیادہ قبولیت حاصل ہوتی ہے۔[۲۰]

۲۔ نصابِ مدارس میں اصلاح اور ہم آہنگی

عصرِ حاضر کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا شرعی حل پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں مناسب حد تک جدید اور عصری علوم کو بھی شامل کیا جائے۔ اس سے طلبہ کو اپنے زمانے کے علمی، معاشی، سماجی اور سائنسی مسائل سے آگاہی حاصل ہوگی اور وہ جدید حالات کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔ اسی طرح دینی اور عصری تعلیم کے درمیان موجود فاصلہ کم ہوگا اور ایسی علمی شخصیات تیار ہوں گی جو شریعت کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بھی واقف ہوں۔

۳۔ اجتہادی اداروں کا قیام

اجتہاد کے مؤثر نفاذ کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر مضبوط اور منظم فقہی اداروں کا قیام ناگزیر ہے۔ ایسے اداروں میں مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین کو نمائندگی دی جائے تاکہ جدید مسائل پر اجتماعی غور و فکر کے ذریعے متفقہ اور مستند رہنمائی فراہم کی جا سکے۔ اس کے ساتھ ان اداروں کے فیصلوں کو علمی اور سماجی سطح پر مؤثر بنانے کے لیے مناسب انتظامات بھی کیے جائیں تاکہ ان کی سفارشات عوام اور ریاستی اداروں تک مؤثر انداز میں پہنچ سکیں۔

۴۔ تقلید اور اجتہاد میں اعتدال کا قیام

اجتہاد کے فروغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ تقلید اور اجتہاد کے درمیان ایک متوازن رویہ اختیار کیا جائے۔ عام مسلمانوں کے لیے ائمۂ مجتہدین کی رہنمائی سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے، تاہم اہلِ علم کے لیے اجتہاد اور تحقیق کے دروازے بند نہیں ہونے چاہییں۔ نہ تو تقلیدِ جامد کو اس حد تک بڑھایا جائے کہ اجتہادی فکر مفلوج ہو جائے اور نہ اجتہاد کے نام پر شریعت کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کیا جائے۔

اعتدال اور توازن ہی وہ راستہ ہے جو فقہی روایت کے تسلسل اور علمی ارتقاء دونوں کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

۵۔ علمی وفکری اعتماد کا ماحول

اجتہاد کی کامیابی کے لیے ایک ایسا علمی ماحول ضروری ہے جس میں اہلِ علم سیاسی دباؤ، سماجی خوف اور گروہی تعصّبات سے آزاد ہو کر تحقیق اور اظہارِ رائے کر سکیں۔ جب علماء کو علمی آزادی میسر ہوگی تو وہ نئے مسائل پر زیادہ سنجیدگی، اعتماد اور دیانت داری کے ساتھ غور و فکر کر سکیں گے۔ اسی طرح اختلافِ رائے کو برداشت کرنے اور علمی مکالمے کی روایت کو فروغ دینے سے اجتہادی فکر مضبوط ہوگی اور امت کو عصرِ حاضر کے مسائل کے بارے میں زیادہ مستحکم اور قابلِ اعتماد رہنمائی حاصل ہو سکے گی۔

حاصل بحث

الغرض، مندرجہ بالا بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اجتہاد اسلامی شریعت کی ایک بنیادی خصوصیت اور اس کی دائمی حیات و حرکت کا مظہر ہے۔ یہی وہ علمی اور فکری قوت ہے جس نے ہر دور میں اسلامی فقہ کو نئے حالات، بدلتے ہوئے معاشرتی تقاضوں اور پیش آمدہ مسائل کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اجتہاد کی بدولت شریعتِ اسلامیہ محض ایک تاریخی ورثہ نہیں رہی بلکہ ہر زمانے میں ایک زندہ، متحرک اور قابلِ عمل نظامِ حیات کے طور پر انسانیت کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کا تصور اسلام کے بنیادی مصادر، یعنی قرآنِ کریم اور سنتِ نبویؐ سے ماخوذ ہے اور امت کے جلیل القدر علماء و فقہاء نے ہر دور میں اس کی ضرورت، اہمیت اور مشروعیت کو تسلیم کیا ہے۔ تاہم عصرِ حاضر میں اجتہاد کے مؤثر اطلاق کی راہ میں متعدد رکاوٹیں حائل ہیں۔ ان میں تقلیدِ جامد، مسلکی تعصب، فکری انتہا پسندی، عصری علوم سے ناواقفیت، اجتہادی اداروں کی کمزوری، سیاسی مداخلت اور علمی آزادی کا فقدان نمایاں ہیں۔ یہ رکاوٹیں نہ صرف اجتہادی عمل کی رفتار کو متاثر کرتی ہیں بلکہ جدید مسائل کے بارے میں متوازن اور مستند شرعی رہنمائی کی راہ میں بھی مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اجتہاد کا مطلب ہرگز دین میں تبدیلی، شریعت کے مسلمہ اصولوں سے انحراف یا بیرونی افکار کی اندھی تقلید نہیں ہے۔ بلکہ اجتہاد دراصل شریعت کے ابدی اصولوں کی روشنی

میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنے کا ایک منضبط، ذمہ دارانہ اور علمی عمل ہے۔ اسی لیے اجتہاد کو ہمیشہ قرآن وسنت، مقاصدِ شریعت اور امت کے علمی ذخیرے کی حدود کے اندر رہ کر انجام دینا ضروری ہے۔عصرِ حاضر کے پیچیدہ اور ہمہ گیر مسائل اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اجتہاد کو انفرادی سطح سے آگے بڑھا کر اجتماعی اور ادارہ جاتی بنیادوں پر فروغ دیا جائے۔ دینی اور عصری علوم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے، علمی مکالمے کو فروغ دیا جائے، اور ایسے مضبوط علمی مراکز قائم کیے جائیں جو مختلف شعبوں کے ماہرین اور اہلِ علم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے امتِ مسلمہ اپنے موجودہ علمی، فکری اور سماجی مسائل کا مؤثر حل تلاش کر سکتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اجتہاد اسلام کی فکری روایت کا ایک زندہ اور ناگزیر عنصر ہے۔ امتِ مسلمہ کی علمی ترقی، فکری بیداری اور دینی احیا کا انحصار اسی بات پر ہے کہ اجتہاد کی صحیح روح کو سمجھا جائے، اس کے اصول وضوابط کی پاسداری کی جائے اور اسے اعتدال، بصیرت اور اجتماعی شعور کے ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق بروئے کار لایا جائے۔

حوالہ جات

۱۔ لسان العرب - ابنِ منظور الافریقی، محمد بن مکرم، دار صادر (بیروت) ۱۳۰۰ھ، ج:۳، ص:۱۳۳

۲۔ المستصفی من علم الاصول - ابو حامد محمد بن محمد الغزالی، دار الکتب العلمیہ، بیروت (لبنان) ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء، ص:۲۸۱

۳۔ الاجتهاد فی مناط الحکم الشرعی، دراسة تاصیلیة تطبیقیة، جلد: اول، ص:۳۱
https://ketabonline.com/ar/books/90591/read?part=16&index=1757780/1757781/1757783&page=3

۴۔ ارشـاد الفحـول إلى تحقيق الحق من علم الأصول – الشوکانی، محمد بن علی، دار الکتب العلمیہ (بیروت) ۱۴۱۹ھ۔ ص:۲۵۰

۵۔ الآمدی، علی بن محمد. الأحكام في أصول الأحكام– المکتب الاسلامی (بیروت) ۱۴۰۲ھ۔ ج:۴، ص:۱۶۲

۶۔ "اجتهاد کی شرائط" دار الافتاء (مصر) [آن لائن، ۲۰۲۳ء]
https//:www.dar-alifta.org/ur/fatwa/details/19656

۷۔ عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید،شاہ ولی اللہ محدث دہلوی،دار الکتب (پشاور)۱۴۳۱ھ،ص:۲۰

۸۔ سنن ابی داؤد،کتاب الاقضیة ، باب اجتهاد الرأی فی القضاء

۹۔ صحیح مسلم،کتاب الاقضیة ، باب بیان اجر الحاکم إذا اجتهد فاصاب او اخطاء

۱۰۔ أصول الفقه الإسلامی -الزحیلی،وہبہ،دار الفکر(دمشق)۱۴۰۶ھ۔ج:۲،ص:۱۰۶۳

۱۱۔ نور الانوار فی شرح المنار – ملاجیون،أحمد بن أبی سعید الأمیتھوی الہندی الحنفی،،مکتبہ امیر (لبنان) ۲۰۱۵ء،ص:۲۴۶

۱۲۔ مزید تفصیل کے لئے مفتی تقی امینی صاحب کی "اجتهاد کا تاریخی پس منظر" ملاحظہ فرمائیں۔

۱۳۔ الاجتهاد فی الشریعة الاسلامیة مع نظرات تحلیلیة فی الاجتهاد المعاصر-یوسف القرضاوی،دار القلم،(کویت)۱۹۸۵ء،ص:۷

۱۴۔ أصول الفقه الإسلامی -الزحیلی،وہبہ،دار الفکر(،دمشق)۱۴۰۶ھ۔ج:۲،ص:۱۰۶۳

۱۵۔ مودودی،تفہیمات،حصہ سوم(اجتہاد کی بحث)

۱۶۔ ارشاد الفحول إلی تحقیق الحق من علم الأصول -الشوکانی،محمد بن علی،دار الکتب العلمیہ (بیروت)۱۴۱۹ھ۔ص:۲۵۰

۱۷۔ عصر حاضر میں اجتہاد۔چند فکری و عملی مباحث،

https//:zahidrashdi.org/2888?hl=en-GB

۱۸۔ ''اجتہاد کی شرعی حیثیت اور عصرِ حاضر میں اجتہاد کی عملی صورتیں'' -محمد تاج الدین اور ظہور اللہ الازہری،مجلّہ التبیین،ج:۱،ع۱(۲۰۱۷ء)،ص:۵۲[آن لائن]

https//:sites2.uol.edu.pk/journals/al-tabyeen/article/view/132

۱۹۔ "الاجتهاد وضرورته فی العصر الحاضر." دعوة الحق"وزارة الأوقاف،مراکش[آن لائن]

https//:www.habous.gov.ma/daouat-alhaq/item/7401

۲۰۔ محمد تاج الدین اور ظہور اللہ الازہری''اجتہاد کی شرعی حیثیت اور عصرِ حاضر میں اجتہاد کی عملی صورتیں''مجلّہ التبیین ، ج:۱،ع:۱(۲۰۱۷ء)،ص۵۲[آن لائن]

https//:sites2.uol.edu.pk/journals/al-tabyeen/article/view/132

ڈاکٹر سید عبدالرشید *

اسلامی مطالعات
روایتی، مغربی اور جدید رجحانات

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے طویل عرصہ میں اسلامی تعلیمات پر مشتمل قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب وتمدن نیز اسلامی فلسفہ وکلام پر مشتمل ایک عظیم علمی سرمایہ وجود میں آیا۔ اس علمی ذخیرے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی عملی زندگی بھی مختلف مقاصد اور زاویۂ نظر کے تحت اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بنی، جس کے نتیجے میں اسلامی مطالعات میں متعدد مناہج اور رجحانات سامنے آئے۔ ان رجحانات کو درج ذیل چار خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- ابتدائی دور کا رجحان
- روایتی رجحان
- مغربی رجحان
- جدید دور کا رجحان

ابتدائی دور کے رجحان سے مراد آغاز اسلام کے بعد سے ابتدائی صدیوں میں اسلام کے مطالعہ اور تحقیق کا وہ منہج ہے جسے اہلِ علم نے اختیار کیا۔ جو اسلامی عقائد پر پختہ ایمان رکھتے ہیں، انھوں نے علمی وتحقیقی جذبے کے ساتھ مذہبی احساس ذمہ داری کے تحت بھی اسلامی علوم ومعارف کے فروغ میں

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا ای میل: rasheedsyed@aliah.ac.in

نمایاں کردار ادا کیا۔ اس رجحان کی نمائندہ جماعتوں میں محدثین، مفسرین اور فقہاء کے سرِ فہرست ہیں۔

اس دور کی نمایاں علمی خدمات میں علوم قرآن کے میدان میں تدوین قرآن کے مراحل، علوم حدیث میں تدوین حدیث، اصولِ حدیث اور فن اسماء الرجال کی تدوین وارتقاء، فقہ میں فقہ اور اصولِ فقہ کی تدوین اور تاریخ کے میدان میں سیرت ومغازی کی تالیف وتدوین شامل ہیں۔ انفرادی سطح پر ائمہ اربعہ، مصنفین کتبِ ستہ، ابن ہشام، ابن سعد اور امام ابوجعفر طبری اس کی نمائندہ شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، جبکہ ادارہ جاتی سطح پر بغداد کا بیت الحکمت اس رجحان کی ایک اہم مثال ہے۔ یہاں سائنسی منہج تحقیق کو فروغ ملا، فلسفہ، حکمت اور سائنس کے مختلف میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دی گئیں، جن کے اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوئے۔ رصد گاہوں کے قیام کے ذریعے فلکیاتی مشاہدات کو وسعت ملی، نئے آلات نے نمایاں ترقی کی۔ تخلیقی فکر، جدت نظر، تحقیق پسندی اور اجتہاد اس ابتدائی رجحان کی بنیادی خصوصیات تھیں۔

روایتی رجحان سے مراد ابتدائی دور کے رجحان کے بعد مسلم ممالک میں رواج پانے والا اسلامی مطالعات کا طریقہ کار ہے، ابتدائی اور روایتی رجحان کے درمیان تاریخی حد فاصل کی تحدید کرنا تو مشکل ہے، البتہ تاتاریوں کے عالم اسلام پر حملے کے بعد سے اس رجحان کے فروغ میں اضافہ نظر آتا ہے، عالم اسلام پر تاتاریوں کی یلغار کی ابتدا ۶۱۶ھ میں ہو جاتی ہے، اور اس کا نقطہ عروج ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں بغداد کی ہلاکو خاں کے ہاتھوں تباہی ہے۔ عالم اسلام پر اس بلائے ناگہانی کے دور رس اثرات مرتب ہوئے اور مسلمانوں کے علمی منہج پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ اجتہاد کی جگہ تقلید اور تخلیق کی جگہ جمود نے لے لی۔ متقدمین کی کتابوں پر شرح لکھنا، پھر اس کا خلاصہ کرنا، پھر اس پر حاشیہ چڑھانا علمی تحقیق کا معیار سمجھا جانے لگا۔ اسلامی علوم ومعارف میں جدت طرازی بالکل معدوم ہو گئی۔ حتیٰ کہ تعقید پیدا کرنا اور پیچیدہ عبارتیں لکھنا ہی کمال سمجھا جانے لگا۔ علوم میں کسی نئی شاخ کا نکالنا اور نئے انداز سے کسی مسئلہ کی تشریح کرنا بدعت سمجھا جانے لگا۔ بیت الحکمت میں ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے اپنے ہی نشیمن کے تنکوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اس دور میں بھی ہم کو چند افراد ایسے ضرور نظر آتے ہیں، جنھوں نے اسلامی لٹریچر میں گراں مایہ اضافے کیے، ان میں امام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) امام شاطبی (۷۹۰ھ) اور ابن خلدون (۸۰۸ھ) نمایاں ہیں، ان حضرات نے عام شاہراہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی اور اسلامی لٹریچر کو اپنی اختراعی ذہنیت سے مالا مال کیا، اور عہد وسطیٰ میں متقدمین کی یاد تازہ کر دی۔

مغربی رجحان سے مراد اسلامی مطالعات کا وہ نقطہ نظر ہے، جس کو یہودیوں اور عیسائیوں نے عموماً اور یوروپ نے خصوصاً اپنایا۔ مغربی رجحان کی سب سے اہم خصوصیت اس کا دین اسلام اور عربی و اسلامی ذخیرہ علم کو عداوت کی نگاہ سے دیکھنا اور اس پر شک کرنا تھا، جس کی وجہ سے وہ بہت کم غیر جانبدار رہ کر تجزیہ کر سکے۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ مغربی رجحان کے زیر اثر ایسے متعدد دانشور تیار ہوئے، جنھوں نے اسلامیات کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کیے، نئے نئے موضوعات متعارف کرائے، مخطوطات کی تحقیق کی اور اسلامی علوم وفنون کی جدید طرز پر تشریح وتوضیح کی۔

جدید رجحان سے مراد وہ رجحان ہے، جس نے مغربی اور مشرقی سماجوں میں پہلے سے چلے آ رہے رجحان کی جگہ لی۔ دراصل مغربی مفکرین نے اسلامیات کے روایتی دھارے پر زبردست اثر ڈالا تھا، جس کی وجہ سے روایتی رجحان جو ایک لگے بندھے طریقے پر صدیوں سے چلا آ رہا تھا نقل وروایت اور تشریح وحاشیہ کے دائرہ سے نکل کر نئی دنیا سے متعارف ہوا۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے کہ جدید رجحان پر سب سے زیادہ اثر انداز مغربی مفکرین اور مغربی علوم وفنون ہوئے۔ ان کی منفی اور مثبت دونوں رسائیوں کے نتیجہ میں عالم اسلام میں ایک نئے رجحان کی شروعات ہوئی جو جدید رجحان کہلایا۔ جدید دور کے رجحان میں روایتی رجحان کی پختگی اور مغربی رجحان کی عقلیت دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ جدید دور کا یہ رجحان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں، کیوں کہ متعدد مسلم اور مشرقی مفکرین نے یوروپی مفکرین کے اسلامی مطالعات کے مغربی طرز پر تنقید کی، خصوصاً ایڈورڈ سعید کی کتاب نے استشراق کے روایتی نقطہ نظر پر سوال اٹھایا، بلکہ خود منصف مزاج مستشرقین نے بھی مغربی رجحان کی غلطیوں کو نشانہ بنایا، اس کے ردعمل کے طور پر مغربی مفکرین میں بھی قدیم روش سے ہٹ کر نیا رجحان پیدا ہوا۔

لہٰذا اسلامی مطالعات کا جدید رجحان ایک عالمی رجحان ہے، جس سے عالم اسلام بھی متاثر ہے اور دنیائے استشراق بھی۔ اس کے نمائندہ اداروں میں عصری جامعات اور تحقیقی ادارے ہیں، اور نمائندہ شخصیات وہ دانش ور ہیں، جنھوں نے ان دانش گاہوں میں پرورش پائی۔ جدید رجحان کے زیر اثر اسلامیات میں نئے آفاق تلاش کیے جا رہے ہیں، نئے موضوعات متعارف کرائے جا رہے ہیں، اس کا اثر روایتی رجحان کے نمائندہ اداروں یعنی مدارس اور نمائندہ شخصیات یعنی علما پر بھی نظر آ رہا ہے، اور کیا عجب کہ اس کے ذریعہ اسلامی مطالعات کے تمام پہلوؤں پر تحقیقی اور تخلیقی رنگ چڑھ جائے، اور نئے دور کا آغاز ہو۔ بقول اقبال:

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

اس مقالے کی آئندہ سطروں میں اسلامی مطالعات کے مغربی رجحان پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلامی مطالعات کا مغربی رجحان

مغرب کی اسلام کی طرف توجہ کے تین ادوار رہے ہیں:

پہلا دور: اس دور میں مغرب نے اسلام کو تہذیب وتمدن کے مصدر کی حیثیت سے دیکھا، اور علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمے کیے۔ اسی دور میں کلیسا نے اسلامی مطالعات کی طرف توجہ کی، اس دور کے آغاز میں فرانس کے راہب جربرٹ دی اوریلاک (Gerbert de Aurillac) نے قرطبہ کا رخ کیا، وہاں علوم حکمت حاصل کیے، اور مسلمان علما کی شاگردی اختیار کی۔ انہی کو آگے چل کر پوپ سلوسٹر دوم کی حیثیت سے جانا گیا۔ پوپ سلوسٹر دوم نے جب رومی کلیسا کا عہدہ سنبھالا تو انھوں نے مشرق و مغرب کو قریب لانے اور علوم فنون اور تہذیب وتمدن میں مسلمانوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے مزید اقدامات کیے۔[۱] اس دور کی درج ذیل خصوصیات تھیں:

(الف) یوروپ کے مدارس میں مسلمان اساتذہ کا تقرر ہوتا تھا، یا ایسے یوروپی باشندوں کا جنھوں نے مسلم ممالک میں تعلیم حاصل کی ہو۔

(ب) یوروپ سے طلبا کے وفود اندلس میں تعلیم حاصل کرنے بھیجے جاتے تھے۔

(ج) اہم عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ شروع ہوا۔ خصوصا ان کتابوں پر توجہ مرکوز کی گئی جو سائنس، لٹریچر، فنون، طب اور فلسفے کے موضوع پر تھیں۔

دوسرا دور: اس دور میں مغربی رجحان میں مذہبی اثرات رونما ہوئے، اس دور کا آغاز صلیبی جنگوں سے ہوتا ہے، صلیبی جنگوں کے منفی اور مثبت دونوں قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ جہاں ایک طرف مشرق ومغرب میں دینی تعصب کی جڑیں گہری ہوگئیں، وہیں مشرق میں عیسائی ریاستوں کے قیام سے انھوں نے مسلمانوں کو قریب سے دیکھا، اب تک وہ صرف عربی علوم ومعارف کو ترجمہ وتشریح کے ذریعہ اخذ کرتے تھے، اس دور میں انھوں نے مشرقی علوم پر نقد کرنا شروع کیا۔ اسی دور میں لاطینی زبان میں قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ کیا گیا۔ فرانس کے جنوبی کلونی میں واقع گرجا کے راہب پطرس اعظم (Peter the Venerable) کی نگرانی میں انگلینڈ کے پادری رابرٹ دی رینی (Robert de

(Ratine)اور جرمن پادری ہرمن (Hermann) نے ۱۱۴۳ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ پطرس اعظم (۱۰۹۲ء تا ۱۱۵۶ء) نے کلونی (Cluny) میں واقع اپنے گرجا کو اسلامی مطالعات کا مرکز بنایا، جہاں سے مسلمانوں اور اسلام کے رد میں کتابیں لکھی جائیں۔[۲] رابرٹ آف چیسٹر (Robert of Chester) عربی زبان وادب اور ریاضیات وفلکیات میں مہارت رکھتے تھے، قرآن مجید کا ترجمہ کیا، اور الخوارزمی کی کتاب الجبر والمقابلہ کا ترجمہ کیا، انگلینڈ میں مثلثات کا علم داخل کیا، کیمیا اور فلک کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔[۳] جیرار دی کریمونا (۱۱۱۴ تا ۱۱۸۷ء) ایطالیہ کے باشندے تھے، طیطلہ میں عربی کا علم حاصل کیا، تقریباً ۸۷ کتابوں کا ترجمہ کیا، جو فلسفہ، طب، ریاضیات، فلک وغیرہ میں تھیں۔[۴] سائنسی کتابوں کے ان تراجم سے یورپ میں علم کی روشنی پھیلی اور نشاۃ ثانیہ کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

اس دور کی درج ذیل خصوصیات رہیں:

(الف) اسلامی مطالعات میں دینی تعصب کا ظہور، صلیبی حملوں میں ناکامی کے بعد عربوں اور مسلمانوں سے مغرب میں نفرت اور کینہ، جس سے دینی تعصب کو ہوا ملی۔

(ب) یورپ کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ اسلامی دنیا کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔

(ج) مغرب نے اسلامی دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی اور اس کو کمزور کرنے کے لیے دو طریقے اپنائے، پہلا اسلامی اقدار کو کمزور کرنے کی کوششیں، دوسرا سیاسی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ مسلم ریاستوں اور مسلم اقوام کے درمیان اختلافات پیدا کرنا۔

(د) مغربی ماہرین نے اسلامی دنیا سے درآمد کیے جانے والے علوم ومعارف پر تنقیدی نگاہ ڈالنا شروع کی۔

(ہ) اسی دور میں مذہب اسلام پر تنقید کرنے کے لیے تصنیفی سلسلہ شروع ہوا۔

تیسرا دور: اس دور کا آغاز سولھویں صدی میں ہوا، سامراجی حوصلہ مندیوں کے زیر اثر یوروپ کے مختلف ممالک میں استشراقی مطالعات کے مراکز وجود میں آئے۔ اس دور کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

(الف) مغرب کا اسلامی علوم وثقافت کی طرف اپنی توجہ میں اضافہ

(ب) چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد عربی کتابوں کی طباعت کے سلسلے کا آغاز

(ج) بڑی جامعات میں مشرقی زبانوں کی کرسیوں کا قیام

(د) عربی علوم کی تدریس کے لیے اسکولوں کا قیام

یوروپ کے مختلف ممالک میں اسلامی مطالعات کے رجحانات

اس دور میں یوروپ میں اسلامی مطالعات کے بڑے مراکز فرانس، اٹلی، برطانیہ، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، پولینڈ اور ڈنمارک میں وجود میں آئے، جہاں استشراق کے عنوان سے اسلامی علوم اور مشرقی زبانوں پر توجہ دی گئی۔

فرانس: فرانس کا اسلام اور مسلمانوں سے قدیم تعلق رہا ہے، اندلس کی فتوحات کے بعد عربوں نے فرانس کے ساحلی علاقوں تک رسائی حاصل کرلی تھی، عباسی خلیفہ ہارون رشید کے شارلیمان شاہ فرانس سے اچھے تعلقات تھے، فرانس نے صلیبی حملوں کی قیادت بھی کی تھی اور اخیر دور میں نپولین بونا پارٹ کی مصر پر فوج کشی اور قبضہ، نیز مراکش، سوریا اور لبنان پر فرانسیسی حکمرانی سے عالم اسلام اور فرانس کے تعلقات میں مزید اضافہ ہوا۔

فرانس نے عربی اور اسلامی ثقافت اندلس اور صقلیہ سے حاصل کی، بارہویں صدی میں پوپ سلوسٹر دوم نے جن کا ذکر اوپر گذرا، ریمس (Reims) میں مشرقی زبانوں کا مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۲۲۰ء میں مونٹ پیلیر (Montpellier) میں طب کا ایک مدرسہ قائم ہوا، جس کے بانی چند مراکشی مسلمان تھے، جلد ہی اس کی شہرت دور دور پھیل گئی۔[۶] کنگ فرانس اول نے ۱۵۱۹ء میں ریمس کے اسکول میں عربی اور عبرانی زبانوں کی چیئر قائم کی۔ نیز ۱۵۳۰ میں کالج بھی قائم کیا، جس میں عبرانی اور یونانی کرسیاں قائم کیں۔ شاہ ہنری سوم نے ۱۵۸۷ میں عربی کی کرسی قائم کی۔[۶] ۱۲۵۷ میں قائم ہونے والے سوربون انسٹیٹیوٹ کو نپولین نے ۱۸۰۸ میں پیرس یونیورسٹی سے ملحق کر دیا تھا، یہاں کے انسٹیٹیوٹ آف لٹریچر نے اسلامی فنون کی تاریخ، مشرقی اقوام کی تاریخ، زبان، لسانیات، اور عربی تہذیب وثقافت کی تاریخ پر خصوصی توجہ دی۔[۷]

فرانس میں اسلامی مخطوطات بھی بڑی تعداد میں محفوظ ہیں، پیرس کے قومی کتب خانے میں سات ہزار عربی مخطوطات ہیں، جن میں سے متعدد ایسے ہیں جن کا شمار نوادر میں ہوتا ہے۔ پیرس سے متعدد جرنلس بھی نکلتے ہیں، جن میں Journal Asiatique, Paris بھی ہے، جس کا آغاز ۱۸۲۲ میں ہوا تھا،[۸] یہ سہ ماہی مجلّہ ہے، جو عربی تاریخ، جغرافیہ، عربی تہذیب وثقافت اور فنون پر کام کرتا ہے، اس کا مغربی ممالک میں بلند مقام ہے۔

برطانیہ: برطانیہ کی اسلام اور شرق اوسط میں دلچسپی کی تاریخ بارہویں صدی میں ہنری دوم تک پہونچتی ہے، البتہ علمی موضوع کے طور پر اس کی تاریخ کی تعیین کیمبرج میں ۱۶۳۲اور آکسفوڈ میں ۱۶۳۶میں عربی ادب کی کرسیاں قائم ہونے سے کی جاسکتی ہے۔ آکسفورڈ میں سب سے پہلے پوپ اکلیمنز پنجم نے ۱۳۱۲ء میں ویانا کی کانفرس میں قرارداد منظور ہونے کے بعد عربی، عبرانی، کلدانی، سریانی زبانوں کے لیے ایک کرسی قائم کی، پھر ۱۶۳۶ میں عربی زبان کے لیے خصوصی چیئر قائم ہوئی، جہاں سامی زبانوں، دراسات اسلامی، مشرق قریب کی تاریخ اور عربی فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی۔[۹] کیمبرج میں ۱۶۳۳ میں سر تھامس ایڈمز نے عربی کی چیر قائم کی، یہاں اٹھارویں صدی میں مغربی مستشرقین کے علاوہ عرب اساتذہ نے بھی تدریس کی خدمات انجام دیں۔[۱۰]

انگلستان میں اسلامی مطالعات کی طرف توجہ اگر چہ دیگر یوروپی ممالک کے مقابلہ بعد میں ہوئی، لیکن یہاں تمام یوروپ کے مقابلہ زیادہ وسیع اور قابل اعتماد طریقہ پر اسلامیات کا مطالعہ کیا گیا، خصوصا جب سے انگلستان کے مشرق بعید اور مشرق وسطی کے ساتھ ثقافتی، عسکری، اقتصادی اور سامراجی تعلقات قائم ہوئے۔ اسلامی مطالعات کے برطانوی رجحان پر علمی رنگ غالب رہا۔ اور یہاں پر اس جانب توجہ دینے والوں کو اسلامیات کے اسباب زیادہ فراہم ہوئے۔ انگلستان نے اسلامی اور عربی ثقافت دو ذرائع سے حاصل کی، ایک ان اساتذہ کے ذریعہ جو یہاں پر عربی واسلامی ثقافت کی تعلیم حاصل کر کے آئے، مثلا طلیطلہ (اندلس) کے فلسفی ابراہیم بن عذرا، جو لندن آئے اور یہاں درس دیا۔ دوسرے وہ انگریز دانش ور جو صقلیہ اور اندلس جا کر عربی ثقافت کا علم حاصل کر کے آئے، مثلا ٹامس بروان، اور راجر بیکن۔ انھوں نے عربی ثقافت اور علوم کو حاصل کیا، بے شمار کتابوں کا ترجمہ کیا، اپنی تصنیفات تیار کیں۔[۱۱]

انگلستان اور یوروپ کے دیگر ماہرین نے جن کو مستشرقین بھی کہا جاتا ہے، عربوں کے علوم کو نقل کیا، اس کی تشریح وتوضیح کی، اور قرون وسطی کی جہالت کا خاتمہ کیا، اس طرح جدید یوروپی انقلاب کے لیے مضبوط بنیاددوں پر راہ ہموار کی، اپنے بعد آنے والوں کے لیے اس میدان میں مزید مواقع مہیا کیے، ان کے جانشینوں نے عربی زبان کا علم حاصل کیا، اس کے درس وتدریس کا اہتمام کیا، مخطوطات کی تحقیق اور ان کے ترجمے کیے، عربی میں کتابیں تصنیف کیں، اور سامی زبانوں سے تعلق کی وجہ سے کتاب مقدس کی ایسی تفسیر کر سکے، جو پروٹسٹنٹ عقیدہ کے مطابق ہو، اسی وجہ سے کلیسا نے آکسفورڈ یونیورسٹی

میں عربی زبان کی کرسی قائم کی، اور یونیورسٹیز کو مشرقی مطالعات کی طرف توجہ کرنے پر ہمت افزائی کی۔ اس طرح انگلستان اور مشرق کے درمیان اقتصادی اور سیاسی روابط استوار ہوئے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں اسلامی مطالعات میں مزید ترقی ہوئی، جس کے کئی عوامل تھے، جس میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں عربی زبان کی دونئی کرسیوں کا قیام، اور ہندوستان اور مشرق بعید میں مغربی طاقتوں کی توسیع پسندی اور مستشرقین کی سرپرستی جیسے اسباب شامل تھے۔ اس دور میں سر ولیم جونز کی وجہ سے جو تمام یوروپ میں ہندوستانیات کے امام سمجھے جاتے تھے، انگلستان، فرانس اور ہندوستان میں طلبہ کی توجہ سنسکرت کی کتابوں کی طرف ہوگئی اور اس کے نتیجہ میں یوروپ کی کئی جامعات میں سنسکرت کے شعبے قائم ہوئے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر نپولین نے مصر پر حملہ کیا، اس کے ساتھ متعدد محققین اور مستشرقین تھے، جس کے نتیجہ میں اسلامی ممالک کے یوروپ سے ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر روابط ہوئے۔ انیسویں صدی میں اس میں مزید اضافہ ہوا، عربی و اسلامی مطالعات میں ترقی ہوئی، نپولین کے ساتھ آنے والے مستشرقین نے بڑے پیمانے پر اسلامی ممالک سے متعلق مواد کی اشاعت کی، فرانس میں داسی (Dassy) کے اسکول سے مستشرقین کی ایک بڑی تعداد فارغ ہوئی، لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کی کرسی قائم ہوئی، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم ہوئیں، ان سوسائٹیز سے جرنلس شائع ہوئے، مستشرقین کو مشرق وسطی آنے اور مسلم ممالک کی زیارت کرنے کے وسیع مواقع مہیا ہوئے۔ ان کے پیچھے سیاحوں اور دانشوروں کی کئی ٹیمیں تھیں۔ یہ مواقع ان کے پیش رو مستشرقین کو مہیا نہیں ہوئے تھے، جب انگریز واپس انگلینڈ پہونچے تو اسلامی مطالعات کی تدریس، ترجمہ و تحقیق اور تصنیف کے لیے آپسی معاونت کے ساتھ کوششیں شروع کیں۔

برطانیہ میں اسلامک اسٹڈیز کا جائزہ لینے کے لیے متعدد کمیٹیاں قائم ہوئیں، اور انھوں نے برطانیہ کے تناظر میں اس کا جائزہ پیش کیا، ۱۹۰۹ میں پیش ہونے والی رے رپوٹ (Reay Report) نے اسلامک اسٹڈیز کا تعارف ان افراد کو مدنظر رکھتے ہوئے کرایا ہے، جو انتظامی، فوجی، تجارتی طبی اور دعوتی مقاصد کے حصول کے لیے اسلامی دنیا کا سفر کرتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کو بھی مدنظر رکھا ہے جو وہاں کی زبانوں اور ثقافتوں کی تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔[۱۲]

۱۹۴۷ء میں پیش ہونے والی اسکار بروگ رپوٹ (Scharbrough Report) نے مابعد عالمی جنگ پر توجہ دی، جب کہ برطانیہ کے سامراج کے تحت رہنے والے ممالک آزادی کی طرف

بڑھ رہے تھے، اور برطانیہ کی پہلی ترجیح ان ملکوں میں اور بین الاقوامی معاملات میں اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنا تھا۔

۱۹۶۱ء میں ہیٹر رپوٹ (Hayter Repor) کے پیش ہوتے ہوتے اکثر ممالک آزاد ہو چکے تھے، سر ولیم ہیٹر (Sir William Hayter) نے اس بات کو نمایاں کیا کہ جس سماج میں جامعات موجود ہوتی ہیں، ان کی ضرورتوں سے اپنے طریقہ کے مطابق نمٹنا جامعات کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ۶ تا ۸ علاقائی مطالعات کے نئے مراکز مختلف جامعات میں قائم کیے جائیں، انھوں نے یہ بھی کہا کہ در ہام یونیورسٹی میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور کیمبرج میں مڈل ایسٹ سنٹر کو مزید تقویت ملنی چاہیے، اور مڈل ایسٹ یا اسلامک اسٹڈیز کے مرکز کی حیثیت سے ان کی توسیع ہونی چاہیے۔ اس رپورٹ نے یہ بھی کہا کہ صرف زبانوں پر توجہ دینے کے بجائے ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات اور قوانین کو استیعاب کے ساتھ پڑھانا چاہیے۔[۱۳]

۱۹۸۶ء میں پارکر رپورٹ پیش ہوئی، اس رپورٹ میں زیر بحث موضوع کو معاشی اور سفارتی تناظر میں دیکھا گیا، ان دونوں پہلوؤں کی طرف گذشتہ دور پورٹوں میں توجہ نہیں دی گئی تھی، اس رپورٹ نے خاص طور ایشیائی اور افریقی زبانوں کی مہارت کے دائروں میں ایک واضح اور مربوط پالیسی کی عدم موجودگی پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔[۱۴]

۲۰۰۷ء میں صدیقی رپورٹ پیش ہوئی، جس نے اسلامیات کی موجودہ صورتِ حال پر گفتگو کی اور برطانوی سماج میں موجود اسلامیات کے نمائندہ رسمی اور غیر رسمی اداروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی، برطانیہ میں اسلامیات کے جدید رجحانات کا تعارف کرایا، اور برطانیہ کے مسلم سماج کو سامنے رکھ کر دس تجاویز پیش کیں۔ اس رپورٹ میں اسلامیات کو برطانوی مسلم سماج کی مذہبی ضرورت کی حیثیت سے پیش کیا۔[۱۵]

اسلامی مطالعات کے سلسلے میں مغربی مفکرین کی اقسام

مغرب میں اسلامی مطالعات کی تحریک جس کو استشراق کے نام سے جانا گیا، بہت وسیع پیمانہ پر پھیلی، اس کے آغاز اور ارتقاء کے مراحل میں مسلسل تبدیلیاں آتی رہیں، اس طویل اور وسیع تحریک میں ہزاروں مغربی اسکالرز نے حصہ لیا، ان کی محنتوں کے میدان، مقاصد واہداف اور نتائج میں یکسانیت کے بجائے طبعی طور پر اختلاف پایا جاتا ہے، اس بنیاد پر ہم ان مغربی مفکرین کو تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان میں سے بعض منصف مزاج اور تحقیقی ذوق رکھنے والے تھے، جنھوں نے

اسلام، نبی اسلام، تاریخ اسلامی اور مسلم تہذیب کی خوبیوں اور خامیوں پر انصاف کے ساتھ نظر ڈالی، دوسرے بعض ایسے تھے، جن کو مذہبی، سیاسی یا علمی تعصب نے انکار اور ناانصافی پر آمادہ کیا، اس طرح ان کی تین بنیادی قسمیں ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہیں:

منصف مزاج مغربی اسکالرز

مغربی محققین میں ایک گروہ ان دانشوروں کا ہے جنھوں نے استشراق کو ایک علمی تحریک کا رخ دیا، اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی، اپنا وقت اور مال بھی اسلامی تحقیقات کے لیے نچھاور کر دیا، اور کبھی نوبت یہاں تک پہونچی کہ خود استشراقی تحریک نے ان کو نقصان پہونچایا، ان کے مقام و مرتبہ پر اثر پڑا، مثال کے طور پر میخائیل اسکاٹ کو ابن رشد کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے تہمتوں کا شکار ہونا پڑا، راجر بیکن کو مشرقی فلسفے پر اعتماد کرنے کی وجہ سے قید و بند کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں، بوسٹل جو اپنے زمانے کا سب سے بڑا مستشرق تھا، بادشاہ بھی اس کی تعظیم کیا کرتے تھے، استشراق کی راہ میں قید ہونا پڑا۔ سائمن اوکلی نے کیمبرج میں عربی کی تدریس کے لیے اپنے آپ کو اتنا وقف کر دیا، کہ اپنی ذات اور گھر والوں کو فقر و افلاس میں مبتلا کر دیا، اور قید میں اپنی کتاب تاریخ المسلمین کا دوسرا حصہ مکمل کیا۔ پرنس کاکتانی نے جو اٹلی کا مشہور مستشرق ہے، اپنی ساری دولت و ثروت اسلامی تحقیقات کے حوالے کر دی، جس کا اندازہ ایک سال میں دس ہزار سونے کے سکوں سے لگایا گیا ہے، اور پھر قلاش ہو گئے۔[۱۶]

مستشرق اسٹوری اپنے ہم پیشہ افراد کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں: عرب ممالک میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام مستشرقین متعصب ہوتے ہیں، یہ خیال پورے طور پر صحیح نہیں ہے، ہاں، ایک گروہ ضرور ایسا ہے جو تعصب سے کام لیتا ہے، اور اس کی وجہ وہ ادارہ ہے، جو ان کو خاص قسم کی تحقیقات کے لیے مالی فراہم کرتا ہے۔ لیکن ان کو ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جس طرح آپ دیکھتے ہیں، عربی کی خدمت دیگر بہتوں نے کی ہے، اور ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ بقدر امکان انصاف سے کام لینے والے بنیں۔[۱۷]

استان لی لین پول اور گوستاف لوبون کا شمار بھی منصف مزاج مستشرقین میں ہے۔ انھوں نے اسلامی تاریخ پر کئی کتابیں لکھیں، جن میں "**تاریخ مصر فی العصور الوسطی**"، "**صلاح الدین**"، "**قصة القاهره**" اور "**دراسات فی المسجد**" ہے، انھوں نے ہی لندن سے ۱۸۸۳ء میں "**مجتمع العربی فی العصور الوسطی**" نامی اہم کتاب طبع کرائی[۱۸] گوستاف لوبون کا فرانس سے تعلق ہے، انھیں یوروپ پر مسلمانوں کے اثرات بلکہ احسانات کا احساس تھا، ۱۸۸۴ میں اپنی

کتاب "**حضارۃ العرب**" لکھی، جس کا عربی ترجمہ عادل زعیتر نے کیا، ایک اور کتاب **الحضارۃ المصریہ** ہے، اور ایک کتاب '**حضارۃ العرب فی الاندلس**" ہے، جس کا ترجمہ عبدالرحمٰن برقوقی نے ۱۹۲۳ء میں کیا ہے۔ لوبون نے اپنی کتاب **حضارۃ العرب** میں اسلامی تہذیب کی دریافت کا انوکھا طریقہ اختیار کیا، انھوں نے اس تہذیب کے تمام عناصر اور ان کے مختلف پہلوؤں کو جامعیت کے ساتھ بیان کیا، نیز دنیا کے دوسرے ممالک پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کو بھی شامل کیا ہے۔ انھوں نے علمی تجزیہ سے کام لیتے ہوئے ماضی اور حال میں روابط تلاش کیے ہیں، اور عربوں اور اسلام کے بارے میں مستشرقین کے رواجی نقطہ نظر سے دوری اختیار کی ہے۔ گوستاف لوبون اسلام اور اسلامی تہذیب کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرنے والے اہم مستشرق ہیں، مصطفیٰ سباعی ان کی کتاب حضارۃ العرب کے بارے میں لکھتے ہیں: اہلِ مغرب نے جتنی کتابیں تصنیف کی ہیں، ان میں اسلام اور اس کی تہذیب کے ساتھ انصاف کرنے والی یہ سب سے عظیم کتاب ہے۔[۱۹]

غیر منصف مزاج مغربی اسکالرز

مستشرقین کا دوسرا گروہ وہ ہے جس نے دین اسلام اور سیرت رسولؐ میں اسلام کو نقصان پہونچایا، ان مستشرقین نے حق کا انکار کرنے کے لیے نہایت چالبازی اور فریب سے کام لیا، انھوں نے علمی تحقیقات میں کافی محنت اور صلاحیت صرف کی، عربی اور اسلامی مطالعات میں درک حاصل کیا اور اس کے ذریعہ سے اہل مشرق کو اپنی پیش کردہ تحقیقات کے مطالعہ اور استفادہ پر مائل کر لیا، ان کی ساری تحقیق برائی پر مشتمل نہیں ہوتی، بلکہ چند سطروں اور صفحات تک محدود ہوتی ہے، ان کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس فن میں اختصاص رکھتا ہو، عام قاری کے لیے وہ معلومات انتشار پیدا کرنے والی ہوا کرتی ہیں۔

ان مستشرقین میں جو دلائل سے روگردانی کر کے اپنی خواہش کے نتائج نکالتے ہیں، فادر لامانس (۱۸۶۲ تا ۱۹۳۷ء) ہیں، انھوں نے اسلامی کتب خانے میں قیمتی اضافے کیے ہیں، بلجیم سے تعلق ہے، فرانسیسی شہریت رکھتے ہیں، ۱۸۷۸ء میں کلیسا سے منسلک ہوگئے، بیروت میں عربی کی تعلیم حاصل کی، اور وہیں عربی کے استاذ بھی مقرر ہوئے، متعدد اسفار کیے، انگلینڈ میں لاہوت (علم السیات: محمد سعید انور) کے معلم رہے، بیروت میں مشنریز کے ذمے دار بھی رہے، مشرقی مطالعات کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، سترہ مرتبہ اصبہانی کی کتاب الاغانی کا مطالعہ قلم ہاتھ میں لے کر کیا، بیروت میں وفات ہوئی۔[۲۰]

استاذ کرد علی نے ان کی کتاب **الاسلام والحضارہ الاسلامیہ** کے کئی مقامات پر تنقید کی

ہے، اور کہا ہے کہ فادر لامانس نے یہ طے کر لیا ہے کہ عربوں کی تاریخ کو دیگر اقوام میں گرا کر دکھائیں، انھوں نے امانت علمی کا بالکل خیال نہیں رکھا، وہ ایک طویل عبارت سے ایک جملہ لے کر اپنے تخیل کو دلیل مہیا کرتے ہیں، وضاعین (حدیث گڑھنے والی: محمد سعید انور) اور قصہ گو افراد کی کتابوں میں سے خرافات کو نقل کر کے دعوی کرتے ہیں کہ وہ ثقہ اور قابل اعتماد مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ فادر لامانس نے ملک شام کی مختصر تاریخ لکھی ہے، جس میں تیرہ سو سال کے دورانیہ میں اسلام یا عربوں کی ایک خوبی مذکور نہیں، بلکہ یہ ثابت کیا ہے کہ عرب جنگوں کے درمیان بزدل ثابت ہوتے ہیں، صرف مال غنیمت کی فکر کرتے ہیں، لوٹ کے لیے تیار رہتے ہیں، انھوں نے فتوحات کے بعد مقامی باشندوں کے ہاتھ میں عدالتوں، بلدیاتی اداروں اور دیگر انتظامات اس لیے رہنے دئے کہ وہ ان کا انتظام کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اس کا سبب دینی تسامح نہیں تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کو اس لیے باقی رہنے دیا کہ وہ ان سے خائف تھا، صلیبی جنگیں یوروپی اقوام کی بہادری کا مظہر ہیں۔ [۲۱]

منفی فکر رکھنے والے مستشرقین میں ایک نام ویلاسی اولیری کا آتا ہے، آئرلینڈ سے تعلق تھا، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبان کے علاوہ مشرق و مغرب کی قدیم و جدید کئی زبانیں مثلا یونانی، لاطینی، عربی، سریانی، عبرانی اور فارسی پر مہارت رکھتے تھے مختصر "**تاريخ الخلافه الفاطميه**" (لندن سے ۱۹۲۳ء) اور **الجزيرة العربيه قبل محمد** (لندن، ۱۹۲۷ء) اور **الفكر العربی ومكانه فی التاريخ** (لندن، ۱۹۲۲ء) ان کی مشہور تصنیفات ہیں، ان کے علاوہ تحقیقی مقالات بھی شائع ہوئے۔ [۲۲]

ڈاکٹر تمام حسان نے ان کی کتاب **الفكر العربی و مكافر فی التاريخ** کا ترجمہ کیا ہے، وہ اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں: کتاب کے مؤلف (ڈیلاس اولیری) کا شمار ان غالی مستشرقین میں ہے، جو عربی تہذیب و تمدن میں اپنے مطلب کی باتوں کی تلاش میں رہتے ہیں، جن میں وہ کوئی ادنی شائبہ بھی پاتے ہیں تو اس کو یونانی یا رومی تمدن سے جوڑ دیتے ہیں، ان کی رائے میں اسلامی فقہ رومی قانون سے ماخوذ ہے۔ ان کی نظر میں اسلامی فلسفہ بھی ہیلینی (ہیلینی فلسفہ سے مراد قدیم یونانی فلسفیانہ فکر کی وہ روایت ہے جو تقریباً ۳۲۳ قبل مسیح میں سکندر اعظم کی وفات کے بعد پھیلی اور رومی دور تک جاری رہی: محمد سعید انور) فلسفے سے ماخوذ ہے، کیوں کہ عربوں نے انھی فلسفیانہ مسائل کے حل پر توجہ دی، جن پر ہیلینی فلاسفہ نے توجہ دی تھی، اسلامی تصوف نے افلاطونیت جدیدہ سے استفادہ کیا تھا، کیوں کہ دونوں میں بعض آراء مشترک ہیں، بلکہ اسلامی عقیدہ میں بجائے خود ہیلینی عناصر موجود ہیں، کیوں کہ اسلام نے بعض

ان آراء کو عقیدہ میں باقی رکھا ہے، جن کو مسیحیت، یا ہیلینی فلسفے نے باقی رکھا تھا۔ یہاں پہونچ کر اولیری اور ان جیسے مستشرقین یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلامی فقہ کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھی گئی ہے، اور اسلامی فلسفے پر اگرچہ ہیلینی اثرات پڑے ہیں، لیکن اس نے اپنی راہ بالکل الگ نکالی ہے، اسلامی ماحول سے وہ پورے طور پر ہم آہنگ ہو چکا ہے، اور اس نے سیرت محمدی سے اپنی جڑوں کو سیراب کیا ہے۔ ان حضرات کے یہ افکار یا تو غفلت پر مبنی ہیں، یا تغافل پر، و احلا هما مر۔ [۲۳] (اور ان میں زیادہ میٹھا بھی کڑوہ ہے: محمد سعید انور)

بلا قصد غلطی میں مبتلا ہونے والے اسکالرز

مغربی اسکالرز کی ایک اور قسم ہے، جن سے اسلامی تحقیقات کے سلسلہ میں نادانستہ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، انھوں نے اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب وثقافت کو نقصان پہونچایا ہے، لیکن بلا قصد وعمد، اس لیے ان کا محاسبہ تو ضروری ہے، لیکن ان پر وہ حکم صادق نہیں آتا جو گذشتہ نوعیت رکھنے والے اسکالرز کے لیے تھا، کیوں کہ وہاں بالقصد ناانصافی تھی، اور یہاں نادانستہ۔ نادانستہ طور پر غلطی میں پڑنے کے کئی اسباب ہیں، مثلاً عربی زبان سے کما حقہ ناواقفیت، عربوں کے اس ماحول اور کلچر سے لاعلمی جہاں قرآن نازل ہوا۔ وغیرہ۔

اس قسم میں ہمارے سامنے کئی نام آتے ہیں، مثلاً رینالڈ نکلسن (۱۸۶۸ تا ۱۹۴۵ء)، ٹرینٹی کالج، کیمبریج سے فارغ ہوئے، رابرٹ سن اسمتھ سے عربی اور ایڈورڈ براؤن سے فارسی کا علم حاصل کیا، براؤن کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ کئی اہم تحقیقات اور تصنیفات کا اسلامی کتب خانے تین اضافہ کیا، جن میں **التاریخ الادبی للعرب** ہے۔ [۲۴] اپنی کتاب **الصوفیه فی الاسلام** کو بیس سال میں مکمل کیا، ڈاکٹر احمد شرباصی نے اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نکلسن کا یہ خیال غلط ہے کہ اسلامی تصوف غیر اسلامی اثرات کے ذریعہ وجود میں آیا ہے، اور بیرونی اثرات یعنی مسیحیت، افلاطونیت اور بدھ ازم کا اس کی تشکیل میں دخل ہے۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ اسلامی عبادات صرف ظاہری رسوم کا نام ہیں، تعجب ہوتا ہے کہ نکلسن جیسا عمیق مطالعہ کرنے والا مستشرق کیسے ان غلطیوں میں پڑ گیا۔ خود ڈاکٹر شرباصی کہتے ہیں: ڈاکٹر نکلسن دیگر مستشرقین کے مقابلہ کم غلطی کرتے ہیں۔ [۲۵]

ایک اور مشہور اسکالر ڈاکٹر اسپرنگر (۱۸۱۳ تا ۱۸۹۳ء) ہیں، جن کو پڑھ کر نہ صرف مسلمان بلکہ خود مستشرقین بھی حیرت میں پڑ جاتے ہیں، ان کی ایک ضخیم کتاب **"حیاة محمد وتعالیمه حسب مصادر لم تستخدم غالبیتها الی الآن"** تین جلدوں میں ہے، انھوں نے ۱۲ سال

ہندوستان میں گزارے، اسلامی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں، طوسی کی فہرست کتب الشیعہ اور سیوطی کی الاتقان کی ہندوستان ہی سے تحقیق واشاعت کی۔ ابن سعد کی ایک جلد بھی کانپور سے ان کو ہاتھ آئی تھی۔ انہی کے معاصر اور جرمن مستشرق رودی بارت نے اسلامی مطالعات وتحقیقات میں ان کی خدمات گنانے کے بعد حضرت محمدؐ کی سیرت کے سلسلہ میں حیرت کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے: توقع تو یہ تھی کہ اسپر نگر اپنے سامنے موجود بے شمار مصادر سے استفادہ کرتے، تاکہ تنقید اور تردید کا کوئی گوشہ باقی نہ رہتا، لیکن انھوں نے جو سیرت کی کتاب تحریر کی ہے، اس نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، اور علمی تحقیق کے اصولوں کا کوئی خیال نہیں رکھا۔[۲۶]

ایڈورڈ سعید اور مغربی رجحان

اسلامیات کے مغربی رجحان میں ایک بڑا انقلاب اس وقت رونما ہوا جب مشہور ادیب اور مفکر ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب Orientalism لکھی۔ ایڈورڈ سعید کی ولادت بیت المقدس میں ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی، مصر اور اس کے بعد امریکہ میں تعلیم حاصل کی، اور نیو یارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں ایک استاذ کی حیثیت سے زندگی گزاری، ان کی کتاب Orientalism سب سے پہلے ۱۹۷۸ء میں شائع ہو کر سامنے آئی، اور اس نے مغرب کے مشرقی تصور پر شدید تنقید کی، ان کی کتاب کی وجہ سے استشراق یا اسلامی مطالعات کی مغربی فکر پر گہرا اثر پڑا، اور مستشرق کا تصور ایک مخطوطات کی تحقیق کرنے والے، آثار قدیمہ پر ریسرچ کرنے والے اور تاریخ کے کسی گمنام گوشہ کو سامنے لانے والے‘‘ سے ہٹ کر سامراجی طاقتوں کے لیے روزینہ پر کام کرنے والے کا بن گیا، جس کا کام صرف مشرقی افراد اور مشرقی تہذیب وتمدن کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور وہاں کے مذاہب پر تنقید کرنا تھا۔ اس کتاب نے اسلامی مطالعات کے مغربی رجحان کی سمت تبدیل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا، اور مغربی مفکرین کو جدید رجحان میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کیا۔[۲۷]

نتائج

گذشتہ بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یوروپی اسکالرز جس معاشرہ یا علم کی شاخ پر کام کرتے ہیں، اس کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں، خواہ وہ تدریس ہو، تصنیف ہو، لائبریری، دارالاشاعت یا میگزین ہوں، اسی سے اپنا معاش وابستہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اسلامی مطالعات کے میدان کو بھی اپنا یا، اور اسے اپنی تحقیق وریسرچ کا موضوع بنایا، چوں کہ یوروپ میں اسلامی لٹریچر کی طرف توجہ کلیسا کے

تحت شروع ہوئی، اور صلیبی جنگوں نے اس پر گہرا اثر ڈالا، اس لیے وہاں عمومی رجحان تنقید، تردید اور خامیوں کو اجاگر کرنے کا رہا، اگرچہ کہ مستشرقین کی ایک معتد بہ تعداد ایسی بھی ہے، جو حق وانصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔

اسلامی مطالعات کے رجحانات مختلف ادوار میں تبدیل ہوتے رہے، اور اس تبدیلی میں سماج کی علمی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتحال کو دخل تھا، ابتدائی دور کا رجحان مذہب کی روح کو سمجھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا، اور روایتی رجحان پر ظاہر داری اور تعقل و درایت سے دوری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، مغربی رجحان پر تحقیق کے ساتھ تعصب کی واضح چھاپ دکھائی دیتی ہے، جب کہ جدید رجحان پر اختیار کرنے والوں کی کوشش یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کے سلسلہ میں مختلف نقطہ نظر کو قریب لایا جائے، دوریوں کو کم کیا جائے، تنقید اور تحقیق کے ساتھ تخلیق کے دامن کو بھی وسیع کیا جائے۔

حواشی

۱۔ موسوعة المستشرقين——عبدالرحمٰن بدوی، دار العلم للملايين (بيروت) ۱۹۹۳ء، ۱۷۷

۲۔ موسوعة المستشرقين——عبدالرحمٰن بدوی، ۱۱۰

۳۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، دار المعارف، (قاہرہ) ۱۹۶۴ء، ۱/۱۲۳-۱۲۴

۴۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، ۱/۱۲۶

۵۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، ۱/۱۵۱

۶۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، ۱/۱۵۲

۷۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، ۱/۱۵۳

۸۔ الاستشراق والمستشرقون مالهم وما عليهم —— السباعی، دار الورق المكتب الاسلامی بلا تاريخ ومقام، ۳۷

۹۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، ۲/۴۳۲

۱۰۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، ۲/۴۳۲

۱۱۔ المستشرقون——نجيب العقيقی، ۲/۴۲۹

12. Great Britain, Donald James Mackay Reay, Report of the Committee appointed by the lords
commissioners of His Majesty's Treasury to consider the organisation of oriental studies in London, (London: Eyre and Spottiswoode, ltd.,

1909).
URL:https://babel.hathitrust.org/cgi/pt?id=hvd.32044079734273

13. William Hayter, The Report of the Subcommittee on Oriental, Slavonic, East European and African studies (London: HER MAJESTY'S STATIONERY OFFICE, 1961). URL:https://archive.org/details/op1266323-1001/mode/2up
14. JD Latham, The Parker Report (Bulletin (British Society for Middle Eastern Studies)), Vol. 13, No. 1 (1986), pp. 3-14. URL: https://www.jstor.org/stable/194962
15. Attaullah Siddiqui, Islam at Universities in England, Submitted to Bill Rammell MP, Minister of State for Lifelong Learning, Further and Higher Education, 2007. URL:https://dera.ioe.ac.uk/id/eprint/6500/1/Updated%20Dr%20Siddiqui%20Report.pdf

۱۶۔ المستشرقون والتاريخ الاسلامی — علی حسنی خربوطلی، الهيئة المصرية العالمة للكتاب، (قاهره)۱۹۸۸ء،۹۹-۹۸

۱۷۔ المستشرقون والتاريخ الاسلامی — علی حسنی خربوطلی،۱۰۲

۱۸۔ المستشرقون والتاريخ الاسلامی — علی حسنی خربوطلی،۱۰۵-۱۰۶

۱۹۔ السباع?،الاستشراق والمستشرقون مال?م وماعل??م،۷۹

۲۰۔ المستشرقون — نجيب العقيقی،۱۰۶۸/۳

۲۱۔ المستشرقون والتاريخ الاسلامی — علی حسنی خربوطلی،۱۰۸-۱۱۱

۲۲۔ المستشرقون — نجيب العقيقی،۵۲۳/۲

۲۳۔ المستشرقون والتاريخ الاسلامی — علی حسنی خربوطلی،۱۱۱-۱۱۲

۲۴۔ المستشرقون — نجيب العقيقی،،۵۲۶/۲-۵۲۷

۲۵۔ المستشرقون والتاريخ الاسلامی — علی حسنی خربوطلی،۱۱۸-۱۱۹

۲۶۔ المستشرقون والتاريخ الاسلامی — علی حسنی خربوطلی،۱۱۹-۱۲۰

۲۷۔ عبد المنعم عجب الفيا الاستشراق فی رؤية أيدورد سعيد، سودانيل رسائی:۱/جولائی۲۰۲۶ء
URL:
الإستشراق فی رؤية إدوارد سعيد .. بقلم: عبد المنعم عجب الفيا – سودانايل